جلد ۴۳ مئی ۱۹۵۵ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابو الاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	مئی ۱۹۷۵ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ	جلد ۸۳

اشارات

مقالات

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۲۵/۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

محرم الحرام ۱۳۹۵ھ (فروری ۱۹۷۵ء) کے ترجمان القرآن میں جناب جسٹس فدیہ الدین کے مقالے "قرآن کا تصورِ ریاست" پر چند معروضات پیش کی گئی تھیں اور ان کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا جسے ان صفحات میں مکمل کیا جا رہا ہے۔

جسٹس صاحب کے پورے مقالے کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن مجید اسلامی ریاست کے قیام کا قطعاً داعی نہیں۔ اجتماعی معاملات میں اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ اس کرہ ارض کو پختہ سیرت و کردار رکھنے والے افراد سے معمور کر دے۔ جسٹس صاحب نے جو بات ارشاد فرمائی ہے اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن انسان کو سیرت کے اعتبار سے بلند مقام پر فائز دیکھنا چاہتا ہے لیکن فاضل مقالہ نگار کے موقف اور طرز استدلال کا اگر دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے تحت الشعور میں دین اور سیاست کی دوئی کا وہی تصور کار فرما ہے جو اہل یورپ کے دماغ پر مستولی ہے۔ اصل سوال سیرت و کردار کی پختگی کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کیا کسی ادارے پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص نظریۂ حیات کی اس دنیا میں عملداری قائم کرے۔ مجرد سیرت و کردار کی پختگی کی باتیں تو شاعرانہ باتیں ہیں۔ انسان جس طرزِ عمل کو سیرت و کردار سے تعبیر کرتا ہے اس کے اندر اس وقت تک قطعاً کوئی معنویت پیدا نہیں ہوتی جب تک وہ نصب العین سامنے نہ ہو جس کے حصول کے لیے کسی قوم کی سیرت پختہ بنانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ جس طرح کسی کتاب کی قدر و قیمت کا تعین اس مقصد سے کیا جاتا ہے جو کسی طالب علم کے پیشِ نظر ہوتا ہے بالکل اسی طرح سیرت و کردار کا تعین بھی اُن مقاصد کی روشنی میں ہوتا ہے جو کوئی قوم حاصل کرنے کی آرزومند ہوتی ہے۔ فلسفے کے ایک طالب علم کے لیے جس طرح طبیعیات کی ایک کتاب دفترِ بے معنی کی حیثیت رکھتی ہے بالکل

اسی انداز سے سیرت و کردار کی رفعت کا مغربی تصور مسلم قوم کے لیے کسی اہمیت کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اہل مغرب نے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے علمی سطح پر جو سازشیں کی ہیں اُن میں ایک نہایت ہی خطرناک سازش یہ ہے کہ اسلامی اصطلاحات اور دینی تصورات میں بظاہر اتنی وسعت پیدا کر دی جائے جس سے اسلام کی ہمہ گیری میں اضافہ ہو اور جس میں انسان کھو کر دینِ حق سے لاشعوری طور پر دُور ہوتا چلا جائے۔ یوں تو اس سلسلے میں سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہاں ہم چند ایک کے ذریعے اس سازش کو بے نقاب کرتے ہیں۔ مثلاً یہ جملے اکثر سُننے میں آتے ہیں کہ "اسلام آفاقی اقدار حیات کا علمبردار ہے۔" "یہ چند ابدی صداقتوں اور ناقابلِ انکار حقیقتوں کا نام ہے۔" "یہ فطرت کا ترجمان ہے۔" اسلام کے بارے میں یہ جملے بادی النظر میں کتنے حسین و دلکش معلوم ہوتے ہیں اور ان سے اسلام کی ہمہ گیری اور آفاقیت کا نقش کس خوبی سے ذہن پر مرتسم ہوتا ہے لیکن دَورِ جدید میں ان جملوں کی مدد ہی سے ذہنوں میں الحاد کا زہر پھیلایا جارہا ہے۔ اسلام کی آفاقی اقدار اور عالمگیر صداقتوں کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جس طرح قوانینِ طبیعی میں صحیح اور غلط، محمود و مذموم، حلال و حرام کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اسلام کے وہی ضابطے صحیح اور برحق ہیں جو اس قسم کے مصنوعی امتیازات سے یکسر پاک ہوں اور جن میں قوانینِ طبیعی کی سی معروضیت پائی جائے۔ اس تصور کو اگر کسی معاشرے میں سرایت کرنے کا موقع مل جائے تو کیا وہ معاشرہ کسی ایسے نظامِ شرعی کو قبول کرنے پر آمادہ ہوسکتا ہے جو خوب و ناخوب، جائز و ناجائز اور حق و باطل کے مابین واضح امتیازات سے عبارت ہو۔ اسلام واقعی آفاقی اقدار کا علمبردار ہے لیکن اس کی آفاقی اقدار کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان میں قوانینِ طبیعی کی سی بے لوثی پائی جاتی ہے اور اس بنا پر ان کے درمیان حق و باطل کی کوئی تفریق باقی نہیں رہتی۔ اسلام کی آفاقی اقدار سے مراد یہ ہے کہ جس خالق نے قوانینِ طبیعی وضع کیے ہیں اسی حاکم مطلق نے قوانینِ شرعی کی تشکیل کی ہے اور یہ قوانین بھی اسی طرح ہمہ گیر اور ازلی و ابدی ہیں جس طرح کہ قوانینِ طبیعی اور ان کا اطلاق تمام انسانوں اور تمام ادوار پر یکساں ہوتا ہے۔

معلوم نہیں کہ قوانینِ طبیعی اور قوانینِ شرعی کے مابین جو بنیادی اور نمایاں فرق ہے اُسے بے خبری کے

عالم میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا یہ حرکت جان بوجھ کر کی جاتی ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شریعت کے تقاضے اور مطالبات نظروں سے یکسر اوجھل ہو جاتے ہیں۔ آپ جب قوانینِ شرعی کو قوانین طبیعی پر قیاس کریں گے تو آپ کے ذہن سے لامحالہ حق کے ساتھ وابستگی کا غیر معمولی احساس اور باطل سے شدید نفرت کا جذبہ ختم ہو جائے گا کیونکہ قوانین طبیعی کے معاملے میں اس طرح کے مثبت اور منفی احساسات بالکل عنقا ہوتے ہیں۔ پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ قوانین شرعی کو قوانین طبیعی سمجھ لینے سے وہ امنگ بھی باقی نہیں رہتی جو ایک حق پرست انسان اپنے دل میں الہامی ضابطوں کے بارے میں پالتا ہے۔ قوانین طبیعی کے متعلق انسان کا فطری احساس یہی ہوتا ہے کہ جو قانون جس صورت میں موجود ہے وہی صحیح ہے نہ تو اس کی ہمہ گیری اور وسعت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی عملداری میں کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں اُن کا خاموش تماشائی کی حیثیت سے مشاہدہ کر کے ان کے اثرات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ ان کے نفاذ کے بارے میں انسان پر قطعاً کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس طرزِ استدلال کو جب ہم آگے بڑھاتے ہیں تو یہ نتیجہ خود بخود اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح انسان قوانین طبیعی کے نفاذ کے سلسلے میں بری الذمہ ہیں بالکل اسی طرح تمام انسانی ادارے قوانین شرعی کے تسلط کے معاملے میں اپنی کوئی ذمہ داری نہیں رکھتے۔ انسان کو جو کچھ درکار ہے وہ صرف یہ کہ انسانی سیرت کو مضبوط بنانے پر زور صرف کیا جائے کیونکہ جب سیرت پختہ ہو جائے گی تو خدا کی بادشاہت دنیا میں خود بخود قائم ہو جائے گی۔ لہٰذا اسلامی ریاست جو ایک انسانی ادارہ ہے، کا قیام اسلامی نقطۂ نظر سے کسی مسلمان کا مطلوب و مقصود قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس ضمن میں جسٹس صاحب کی تصریحات ملاحظہ ہوں:

> "قرآن مجید کا مقصد یہ ہے کہ اس دنیا کو مضبوط سیرت و کردار رکھنے والے افراد سے آباد کیا جائے جو بیک وقت نیک اور خدا ترس ہوں (قرآن) کے پیش نظر زمین پر آسمانی بادشاہت قائم کرنا ہے، سلطنتیں تعمیر کرنا نہیں۔"

اس فقرے کے بعد فاضل مقالہ نگار بڑے حقارت آمیز لہجے میں اسلامی ریاست کی یوں تعریف بیان کرتے ہیں:

> "(اسلامی) ریاست بجز اس کے اور کیا ہے کہ وہ لوگ جو اطاعتِ خداوندی میں وقت کے تعین کے بغیر زندہ رہنے اور جان دینے کے متمنی ہیں وہ اقتدار اور دولت کے حصول

کی خواہش کرنے لگیں۔"مث

ان چند جملوں میں جسٹس صاحب نے اپنے خیالات کی روح کشید کر رکھ دی ہے اور اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ اس پر کوئی حرف گیری نہ کی جا سکے۔ ان جملوں پر اگر غور کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک غلط بات کو فلسفیانہ رنگ دے کر صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے لیکن مغلق عبارت اور اُلجھے ہوئے طرز استدلال سے حقیقت کو تو نہیں جھٹلایا جا سکتا۔ آپ ذرا اُن کی منطق ملاحظہ فرمائیں، ہیرلڈ لاسکی کے ایک قول کا سہارا لے کر وہ یہ فرماتے ہیں کہ ریاست کا نظریہ زمانے کے سیاق و سباق ہی میں صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے لیکن چونکہ قرآن کی اصطلاحات زمانے سے ماورا ہونے کی بنا پر ازلی و ابدی ہیں اس بنا پر اسلامی ریاست کا تصور قرآن مجید کی آفاقیت کی نفی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اگر قرآنی تعلیمات آفاقی اور ازلی تسلیم کر لی جائیں تو پھر اسلامی ریاست کا وجود غلط ہے اور اگر یہ بات مان لی جائے کہ اسلام ریاست کا ایک مخصوص نقشہ بھی پیش کرتا ہے تو پھر ہم پر اسلامی تعلیمات کے آفاقی مزاج کا انکار لازم آتا ہے۔ اب اگر ہمیں اسلام کی آفاقیت کو برقرار رکھنا ہے تو ہمیں لامحالہ اسلامی ریاست کے قیام کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔

فاضل مقالہ نگار اور اس انداز پر سوچنے والے دوسرے اصحابِ علم کے نزدیک اسلام کی آفاقیت کو برقرار رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسلام کے وہ سارے ادارے جن پر زمان و مکان کی چھاپ لگنے کا کوئی احتمال ہو سکتا ہے انہیں دین سے خارج کر دیا جائے مثلاً آپ اسلامی ریاست کو ہی لیجیے۔ ان حضرات کے استدلال کے مطابق حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفا نے مملکت کا جو ڈھانچہ قائم کیا تھا وہ چونکہ ایک خاص دور اور اس دور کے مخصوص تقاضوں کے تحت معرضِ وجود میں آیا تھا اس لیے "اصل اسلام" سے جو آفاقی اقدار کا حامل ہے، اس کا کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک انسانی ادارہ تھا جو اس دور کے انسانوں کے ساتھ دفن ہو گیا۔ اسی استدلال کے مطابق اسلام کے تمام دوسرے ادارے جن کا تعلق حیاتِ انسانی کے اجتماعی معاملات سے ہے، کالعدم قرار پاتے ہیں۔

ممکن ہے بعض حضرات کے لیے یہ انکشاف ہو لیکن جو لوگ اسلام کے خلاف برپا ہونے والے مختلف فتنوں کی نوعیت کو جانتے ہیں انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ فتنہ انکارِ حدیث بھی اسلام کی "آفاقی" حیثیت

کو قائم رکھنے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے جس حصے کو ہم سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعبیر کرتے ہیں وہ آخر اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منشا خداوندی کو جس انداز اور جس شکل وصورت کے ساتھ پیکرِ محسوس میں ڈھال کر اس کے عملی مقتضیات کی وضاحت فرمائی وہ بھی دین کا ایک لازمی حصہ ہی ہے۔ اس حقیقت کو آپ یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ دین کی آفاقی اقدار کو عملی زندگی کا پیرہن عطا کرنے کا جو کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سر انجام پایا وہی سنت رسولؐ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آفاقی تعلیمات کے عملی مضمرات واضح کرنے کے لیے کئی ایک انسانی ادارے قائم کیے اور جو پہلے سے موجود تھے ان کی تطہیر کر کے انہیں منشا خداوندی کے مطابق از سر نو مرتب کیا۔ ان اداروں کی شکل وصورت میں بلاشبہہ زمان ومکان کا عکس بھی موجود تھا لیکن اس عکس سے اسلام کی آفاقی رُوح کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوتی کیونکہ یہ ادارے اسلام کے آفاقی مزاج کی عملی توجیہہ کے لیے ہی قائم کیے گئے تھے۔

منکرین حدیث سنت کی ابدی حیثیت کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے رسول کی حیثیت سے جو پیغام دیا وہ قرآن کی صورت میں ایک آفاقی دعوت کے طور پر موجود ہے لیکن اس دعوت کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جو ادارے جس انداز اور جس صورت میں قائم کیے گئے اُن پر چونکہ وقت کی چھاپ تھی اس لیے وہ اسلام کے سرمدی پیغام کے ترجمان نہیں ہو سکتے۔ منکرین حدیث کے مقابلے میں اہل سنّت کا مسلک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے ابدی پیغام کی عملی توضیح وتشریح کے لیے معیشت، معاشرت، ریاست اور عبادت کا جو مخصوص نظام اور ڈھانچہ تیار کیا وہ اسلام کے سرمدی پیغام کا اسی طرح ایک حصہ ہے جس طرح کہ قرآن مجید کی تعلیمات لہٰذا وہ سارے انسانی ادارے جن کی تشکیل وترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں ہوئی وہ بھی دین کی مقدس تعلیمات کی طرح مقدس ہیں اور اسلام اس باب میں مسلمانوں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ جہاں وہ دینِ حق کے تقاضے پورے کرنے کے لیے نظامِ عبادت قائم کریں وہاں وہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے نظامِ معاشرت، نظامِ معیشت اور نظامِ مملکت کو اسی نہج پر ترتیب دیں جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جلیل القدر جاں نثاروں نے حیاتِ اجتماعی کو ترتیب دیا تھا۔

جس طرح خداوند تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے فرائض ادا کیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی بالکل اسی طرح انسان خدا کا قرب اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اُن اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش نہ کرے جنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مقدس میں پورا کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی تھی اگر حج ایک دینی فریضہ ہے تو بدر و حنین کی معرکہ آرائی بھی ایک دینی تقاضا ہی ہے، اگر نماز کے ادا کرنے سے خدا کا قرب نصیب ہوتا ہے تو اسلام کے نظام عدل کا قیام بھی اسی کی رضاجوئی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اگر معروف کی پابندی اور منکرات سے اجتناب مالک الملک کی خوشنودی کا باعث بن سکتا ہے تو جو نظام معروف کی عملداری قائم کرنے اور منکرات کے استیصال کے لیے قائم کیا جاتا ہے اُسے بھی خالق کائنات بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو لوگ اس کے قیام کے لیے سعی و جہد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی خوشنودی کے پروانے عطا کرتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ	(مسلمان) وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ	اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے۔
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا	زکوٰۃ دیں گے۔ اور بدی سے روکیں گے۔
عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (الحج ۴۱)	

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں پر بہ حیثیت جماعت یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ تمکن فی الارض حاصل ہوجانے کی صورت میں وہ ایک ایسا صالح نظام قائم کریں جس میں نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے ساتھ نیکی کو فروغ حاصل ہو اور بُرائی کی جڑ کٹ جائے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ فرائض کوئی بااختیار انسانی ادارہ ہی سرانجام دے سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ فرائض عاید کیے ہیں تو لامحالہ انہیں اس بات کا بھی مکلف ٹھہرایا ہے کہ وہ ایسا ادارہ قائم کریں جس کی مدد سے وہ ان اجتماعی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوسکیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے اسلامی ریاست کے مقاصد نہایت واضح الفاظ میں متعین کر دیے ہیں تو پھر یہ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے کہ اس ذات برحق نے ریاست کے وجود کو غیر ضروری قرار دیا ہوگا۔ قرآن مجید میں بڑے

کھلے انداز میں اسلامی ریاست کے مقاصد کی یوں نشاندہی کی گئی ہے۔

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ج

ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

(الحدید ۲۵)

معاشرے میں اجتماعی عدل کے قیام کی ذمہ داری وہ نازک اور مقدس ذمہ داری ہے جو اُمت مسلمہ کے کندھوں پر انبیاء کے جانشین کی حیثیت سے ڈالی گئی ہے۔ اگر اجتماعی عدل کا قیام ایک مقدس دینی فریضہ ہے تو جس ذریعے سے یہ ارفع و اعلیٰ مقصد حاصل ہو سکتا ہے وہ ذریعہ بھی اتنا ہی مقدس ہے جتنا کہ خود یہ مقصد۔ یہ ایک معقول اور سیدھی سادھی بات ہے مگر جسٹس صاحب کو اس سے شدید اختلاف ہے ان کے نزدیک یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اسلامی قوانین کو ریاست کی قوتِ نافذہ کے ذریعے کسی معاشرے میں نافذ کیا جائے۔ جسٹس صاحب کا استدلال ملاحظہ ہو:

> "اگر مسلمانوں کو تمکن فی الارض حاصل ہو جائے تو نہی عن المنکر کا یہ مقصد ہوگا کہ غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے اور مومنین کو بہتر مسلمان بنانے کے لیے قوت کا استعمال کریں۔ میرے نزدیک اس تمکن کی یہ غرض کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس آیت کا یہ مطلب لینا روح قرآنی کے منافی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے پاکیزہ زندگی کی مثال پیش کرکے ان کا اعتماد حاصل کیا جائے اور پھر انہیں ترغیب کے ذریعے (راہ راست) پر لایا جائے۔"

ان ارشادات کے بعد جسٹس صاحب اپنا سارا زورِ بیان اس امر کی وضاحت میں صرف کرتے ہیں کہ اسلام جیسا دین فطرت جو رواداری کا زبردست داعی ہے وہ قوانین شرعی کے نفاذ میں قوت کے استعمال کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے آیت لا اکراہ فی الدین کے سیاق وسباق پر غور کیے بغیر جس طرح غلط استدلال کیا ہے اسے کسی اعتبار سے بھی علمی طرز استدلال نہیں کہا جا سکتا۔

معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ بات کہاں سے اخذ کر لی ہے کہ دورِ جدید کے مسلم ... شرعی (باقی بر صفحہ ۷۴)

فصل چہارم

آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

(۵)

آخرت میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا آخری اہم بات جو قرآن مجید نے آخرت کے سلسلے میں بتائی وہ یہ تھی کہ وہاں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوگی، کجا کہ کسی کو اپنے باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، شوہر، دوست یا مرید اور پیر کو بچانے کی فکر ہو۔ ہر شخص اپنے اعمال کا بوجھ خود اٹھائے گا، کوئی نہ کسی دوسرے کا بوجھ رتّی برابر بھی اُٹھانے کے لیے تیار ہوگا، اور نہ خدا کا انصاف یہ گوارا کرے گا کہ ایک کا بارِ گناہ دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ فیصلہ اُس وقت بالکل اللہ رب العالمین کے ہاتھ میں ہوگا جو مالک یوم الدین ہے۔ اُس دربار میں بولنے کا یارا کسی کو نہ ہوگا الّا یہ کہ اللہ خود اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۔ (الفاطر: ۱۸)

کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دُوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔ اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اُٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصہ بھی ہٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

"بوجھ" سے مراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، اور ہر ایک پر صرف اس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی ذمہ داری کا بار خود اپنے اُوپر لے لے اور اُسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوا دے۔ یہ بات

یہاں اس بنا پر فرمائی جا رہی ہے کہ مکۂ معظمہ میں جو لوگ اسلام قبول کر رہے تھے، اُن سے اُن کے مشرک رشتہ دار اور برادری کے لوگ کہتے تھے کہ تم ہمارے کہنے سے اِس نئے دین کو چھوڑ دو اور دینِ آبائی پر قائم رہو، عذاب ثواب ہماری گردن پر۔

پہلے فقرے میں اللہ کے قانونِ عدل کا بیان ہے کہ وہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو نہ پکڑے گا، بلکہ ہر ایک کو اُس کے اپنے ہی گناہ کا ذمہ دار ٹھیرائے گا۔ اور بعد کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ آج یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری ذمہ داری پر کفر و معصیت کا ارتکاب کرو، قیامت کے روز ہم تمہارا بارِ گناہ اپنے اُوپر لے لیں گے، وہ دراصل محض ایک جھوٹا بھروسہ دلا رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی اور لوگ دیکھ لیں گے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں تو ہر ایک کو اپنی پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے منہ موڑ لے گا۔ اور کوئی کسی کا ذرہ برابر بوجھ بھی اپنے اُوپر لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ	اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے
وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ	باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ اُن میں
وَبَنِيهِ - لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ	سے ہر شخص پر اُس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اسے اپنے
يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ -	سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔

(عبس - ۳۴ تا ۳۷)

بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اُن عزیزوں کو جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے مصیبت میں مبتلا دیکھ کر، بجائے اس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا اُن سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے نہ پکار بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر یہ سب جس طرح ایک دوسرے کی خاطر گناہ کرتے اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہگاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے، اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدمہ کے گواہ بننے والے ہیں۔

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۝	اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا
يُبَصَّرُونَهُمْ - يَوَدُّ الْمُجْرِمُ	حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے مجرم چاہے گا

لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ	کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو،
بِبَنِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ	اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین
وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ وَ	خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور روئے
مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ	زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ
يُنْجِيْهِ ۔ (المعارج - ۱۰ تا ۱۴)	تدبیر اُسے نجات دلا دے۔

یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہوں گے اِس لیے نہ پوچھیں گے۔ بلکہ ہر ایک اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا، کیونکہ اس کو اپنی ہی پڑی ہوگی۔ اس کے برعکس وہ چاہے گا کہ ان سب کو فدیہ میں دے کر خود چھوٹ جائے۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا	ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع
شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (المومن - ۱۸)	جس کی بات مانی جائے۔

ظالم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے حق پر ظلم کر کے ناحق اور ناراستی کا طریقہ اختیار کیا ہو۔ حمیم سے مراد کسی شخص کا ایسا دوست ہے جو اس کو پٹتے دیکھ کر جوش میں آئے اور اُسے بچانے کے لیے دوڑے۔ آخری بات برسبیل تنزل، کفار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے۔ حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کرنے کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے، اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فساق و فجار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ انھیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال بھی کریں۔ لیکن چونکہ کفار و مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے، اور آج بھی ہے، کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے بلکہ اَڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور ہم کو بخشوا کر ہی چھوڑیں گے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے، اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	وہ دن جبکہ روح (جبریلؑ) اور فرشتے صف بستہ
صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ	کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جس کو
لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۔	رحمان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔
(النبا - ۳۸)	

یعنی میدانِ حشر میں دربارِ الٰہی کے رعب کا یہ عالم ہوگا کہ اہلِ زمین ہوں یا اہلِ آسمان، کسی کی بھی یہ مجال نہ ہوگی

کہ از خود اللہ تعالیٰ کے حضور زبان کھولے، یا عدالت کے کام میں مداخلت کر سکے۔ بولنے سے مراد شفاعت ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی۔ایک یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اُسی شخص کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا بجائے خود درست بات کہے، بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے۔ اس میں مزید ایک شرط یہ بھی نکلتی ہے کہ جس کے معاملہ میں وہ سفارش کرے وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو۔ یعنی محض گنہگار رہو، کافر نہ ہو۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ	یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی
شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ	کے بس میں نہ ہوگا اور فیصلہ اُس دن بالکل اللہ
لِّلَّهِ۔ (الانفطار - ۱۹)	کے اختیار میں ہوگا۔

یہ تھا دعوتِ اسلامی کا چوتھا نکتہ جس کو اِس زور کے ساتھ، اِس معقول انداز میں، اِتنی وضاحت سے پیش کیا گیا کہ اُس کے سامنے کفار کے محض ٹھٹھے، اور یہ احمقانہ مطالبے کہ اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو، کسی طرح ٹھیر نہ سکتے تھے۔ جو لوگ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے لڑ رہے تھے، اور جن کو بہر حال لڑنا ہی تھا، اُن کو چھوڑ کر ہر ذی ہوش آدمی یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آخرت کا برپا ہونا نہ امکان سے خارج ہے، نہ عقل کے خلاف ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ خدا کے سامنے جواب دہی کے احساس سے خالی ہو کر دنیا میں انسان کا طرزِ عمل حق اور انصاف کے مستقل اصولوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو سکے، اور نہ انسان کو حقیقی اور مکمل انصاف اِس کے سوا کسی اور طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ موجودہ نظامِ عالم ختم ہونے کے بعد قیامت اور حشر برپا ہو، تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے مالکِ کائنات کے سامنے پیش کیا جائے، اور بالکل بے لاگ طریقے سے ہر شخص کی ذمہ داری مشخص کر کے جزا یا سزا، جس کا بھی وہ مستحق ہو اُسے دی جائے۔

فصل پنجم

اخلاقی تعلیمات

دعوتِ اسلامی نے یہ عقائد اتنے مدلل اور موثر طریقہ سے پیش کرنے کے ساتھ اخلاق کا بھی ایک نہایت واضح

تصوّر لوگوں کے سامنے رکھ دیا جس سے قرآن کے سننے اور پڑھنے والے ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہوگیا کہ اسلام کس قسم کے اخلاق پسند اور کس قسم کے ناپسند کرتا ہے۔ انسانیت کا کونسا نمونہ اُس کے نزدیک بُرا ہے جسے وہ بدلنا اور مٹانا چاہتا ہے اور کونسا نمونہ اچھا ہے جسے وہ تیار کرنا، پروان چڑھانا اور فروغ دینا چاہتا ہے۔ بُرائی اُس کی نگاہ میں کیا ہے، کیا اُس کے پیدا ہونے کے اسباب ہیں، کیا شکلیں وہ انسانی زندگی میں اختیار کرتی ہے، اور کیا چیزیں اسے نشوونما دیتی ہیں۔ اس کے برعکس بھلائی اس کی نظر میں کیا ہے، کیا چیز اس کا سرچشمہ ہے، کس طرح اس کے ظہور کی راہیں کھلتی ہیں، اور کن شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اسلام کا مقصد ہی بُرائی کے اسباب کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا اور بھلائی کی راہوں کو ہموار کرنا، زیادہ سے زیادہ کشادہ کرنا اور افراد سے لے کر معاشرے تک ہر شعبۂ حیات میں بُرائیوں کی جگہ بھلائیوں کو قائم کرنا ہے۔ یہ بیان اسلامی دعوت میں اتنا مفصل، اتنا صریح، اتنا دل نشین اور عقلِ عام کے لیے اِس قدر قابلِ فہم تھا کہ جاہلیّت کے معاشرے میں صدیوں سے جو لوگ اخلاقی پستیوں میں مبتلا تھے ان کے لیے بھی یہ سمجھنا کچھ دشوار نہ تھا کہ واقعی انسانیت کا وہ نمونہ بدترین ہے جسے اسلام بُرا کہہ رہا ہے اور وہی نمونہ بہترین ہے جس کے سانچے میں وہ افراد اور معاشرے کو ڈھالنا چاہتا ہے۔

اخلاق کے مسئلے میں چند بنیادی حقائق اس سلسلے میں سب سے پہلے چند حقائق لوگوں کے سامنے پیش کیے گئے تاکہ اخلاق کا مسئلہ بنیادی طور پر اُن کی سمجھ میں آجائے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ (الشمس، ۷ تا ۱۰)	اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے ہموار کیا، پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اُس پر اِلہام کر دی، یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوگیا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

نفسِ انسانی کو ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ خالق نے اُس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست اپنے ہاتھ پاؤں، اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا۔ اس کو دیکھنے، سننے، چھونے، چکھنے اور سونگھنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر اُس کے لیے بہترین ذریعۂ علم بن سکتے تھے۔ اُس کو قوّتِ عقل و فکر، قوّتِ استدلال و استنباط، قوّتِ خیال، قوّتِ حافظہ، قوّتِ تمیز، قوّتِ فیصلہ،

قوت ارادی، اور دوسری ایسی ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دنیا میں اُس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اُسے جبلّی بد معاش اور پیدائشی گناہ گار بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی خِلقی کجی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔

الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصور یا خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اُتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی پر اس کی بدی اور نیکی و پرہیزگاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی، دونوں کے رُجحانات و میلانات رکھ دیے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز بُرائی، اچھے اخلاق و اعمال اور بُرے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فجور (بدکاری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (بُرائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اُس کی فطرت ان سے آشنا ہے اور خالق نے بُرے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اُس کو عطا کر دی ہے۔

تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا، اُبھارنا اور نشوونما دینا۔ اور تدسیہ کا مطلب ہے دبانا، چھپانا، بہکانا اور گمراہ کر دینا۔ آیت میں یہ بات فیصلہ کن طریقے سے کہی گئی ہے کہ انسان کی فلاح اور نامرادی کا سارا انحصار اس سوال پر ہے کہ اللہ نے جو قوتیں اُس کو دی ہیں اُنھیں استعمال کر کے وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رُجحانات میں سے کن کو اُبھارتا اور کن کو دباتا ہے۔ فلاح صرف اُس شخص کے لیے ہے جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے، اُس کو اُبھار کر تقویٰ کی بلندیوں پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائیوں کو نشوونما دے۔ اِس کے برعکس نامراد ہے وہ جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رُجحانات کو اُبھارنے اور نشوونما دینے کے بجائے اُن کو دبا دے، اُس کو بہکا کر بُرائی کے رُجحانات کی طرف لے جائے، اور فجور کو اُس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اُس کے نیچے اس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد چھپ جاتی ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ	ہم نے انسان کو (ماں اور باپ کے) ایک مخلوط
اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ	نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں، اور
سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا - اِنَّا هَدَيْنٰهُ	اِس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا
السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ	بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا

إِمَّا كَفُورًا (الدھر۔۲-۳) بنے یا کفر کرنے والا۔

ماں اور باپ کے مخلوط نطفے سے تو انسان کی طرح جانور بھی پیدا ہوتا ہے، مگر انسان اور جانور میں فرق یہ ہے کہ جانور اس دنیا میں امتحان کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے اور انسان امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے جانوروں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اس کو سمیع و بصیر بنایا، یعنی علم و عقل کی طاقتیں بخشیں، تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ پھر محض یہی طاقتیں دے کر اسے چھوڑ نہیں دیا بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی تاکہ وہ یہ جان لے کہ بندۂ خدا ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے شکر کا راستہ کونسا ہے اور کفر (ناشکری) کا راستہ کونسا۔ اب اُس کا امتحان اس امر میں ہے کہ دونوں راہوں کے فرق سے آگاہ ہونے کے بعد وہ اپنی ان طاقتوں سے کام لے کر شکر کی راہ اختیار کرتا ہے یا کفر کی راہ۔

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا	کیا ہم نے اسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو
وَشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ	ہونٹ نہیں دیے؟ اور دونوں نمایاں راستے اسے نہیں
(البلد۔ ۸ تا ۱۰)	دکھا دیے؟

یعنی کیا ہم نے اس کو علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیے؟ دو آنکھوں سے مراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد بھی محض بولنے کے آلات نہیں ہیں، بلکہ نفسِ ناطقہ ہے جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا اور ان سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اُسے یونہی چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے، بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے اس کے سامنے بھلائی اور بُرائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے بھی نمایاں کر کے رکھ دیے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کرے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي	ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر
أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ	اُلٹا پھیر کر ہم نے اسے سب نیچوں سے نیچ کر
أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ	دیا، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔	جنہوں نے نیک اعمال کیے۔
(التین۔ ۴ تا ۶)	

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ اعلیٰ درجے کا جسم عطا کیا ہے جو کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دیا، اور اسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشیں۔ مگر جب وہ ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے پھر بُرائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے گراوٹ کی اِس انتہا کو پہنچا دیتا ہے کہ کوئی ارذل ترین مخلوق بھی اُس تک نہیں پہنچی۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیض و غضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں سے جس خصلت میں بھی آدمی مُستغرق ہوتا ہے اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف اسی ایک بات کو دیکھیے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں سب درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لیے کسی جانور کا شکار کرتا ہے، جانوروں کا قتلِ عام نہیں کرتا۔ مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ احسنِ تقویم پر پیدا کیا ہوا انسان اپنی عقل اور قوتِ ایجاد سے کام لے کر ایک سے ایک مہلک ہتھیار بناتا چلا جاتا ہے تاکہ پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے۔ درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے۔ مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے ایسے ایسے دردناک طریقے اختراع کرتا ہے جن کا تصور بھی کسی درندے کے دماغ میں کبھی نہیں آسکتا۔ پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کمینہ پن کی اس انتہا کو پہنچتا ہے کہ دشمن کی عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے۔ ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ باپوں اور بھائیوں اور شوہروں کے سامنے ان کی بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کی عصمت لوٹتے ہیں۔ بچوں کو ان کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں۔ ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں۔ انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو انسانوں کی اس وحشت کا کسی درجے میں بھی مقابلہ کرسکتی ہو۔ یہی حال دوسری بُری صفات کا بھی ہے کہ ان میں سے جس طرف بھی انسان رُخ کرتا ہے، اپنے آپ کو ارذل المخلوقات ثابت کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ مذہب جو انسان کے لیے مقدس ترین شے ہے۔ اُس کو بھی وہ اتنا گرا دیتا ہے کہ درختوں اور جانوروں اور پتھروں کو پوجتے پوجتے پستی کی انتہا کو پہنچ کر مرد و عورت کے اعضائے جنسی تک کو پوج ڈالتا ہے اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے عبادت گاہوں میں دیو داسیاں رکھتا ہے جن سے زنا کا ارتکاب

کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ جن ہستیوں کو وہ معبود کا درجہ دیتا ہے اُن کی طرف اس کی دیو مالا میں ایسے ایسے گندے قصّے منسوب ہوتے ہیں جو ذلیل ترین انسانوں کے لیے بھی باعث شرم ہیں۔

اِن حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن نے واضح طور پر نفسِ انسانی کی تین الگ الگ قسمیں بیان کیں۔ ایک نفسِ امّارہ، جو آدمی کو برائیوں پر اُکساتا ہے (یوسف۔۵۳)۔ دوسرا نفسِ لوّامہ، جو انسان کو برائی کے خیال، خواہش، ارادے اور فیصلے تک ہر مرحلے پر ٹوکتا ہے اور اس کا ارتکاب کر گزرنے کے بعد ملامت کرتا رہتا ہے۔ (القیامہ۔۲)۔ تیسرا نفسِ مطمئنّہ، جو پورے اطمینان قلب کے ساتھ برائی کی راہ چھوڑ کر بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے، اور اُسے اِس بات پر کوئی حسرت لاحق نہیں ہوتی کہ اُس نے برائی کی لذتوں اور فائدوں کو کیوں چھوڑا اور بھلائی کی خاطر کیوں محرومیاں، قربانیاں، تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں۔ اِس پر حسرت تو درکنار، اُس کا دل اِس بات پر خوش ہوتا ہے کہ وہ برائی کی گندگی سے بچ گیا، اور بھلائی کی پاکیزگی اُسے حاصل ہو گئی۔ اِسی تیسری قسم کے نفس کو قرآن نے خدا کا پسندیدہ نفس قرار دیا اور اسے جنت کی خوشخبری سُنائی ہے (الفجر۔ ۲۷ تا ۳۰)

اسبابِ ضلالت اس کے بعد قرآن مجید میں ایک ایک کر کے اُن اسباب کو بیان کیا گیا جن کی بدولت انسان بالعموم گمراہی میں مبتلا ہوتے رہے ہیں، اور جو قرآن کے اوّلین مخاطب، کفارِ قریش اور عام کفارِ عرب کی بھی گمراہی کے اسباب تھے۔

۱۔ باپ دادا کی اندھی تقلید ان میں سے اوّلین چیز دینِ آبائی کی اندھی تقلید ہے جو صرف اس بنا پر کی جاتی رہی ہے کہ باپ دادا سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے، اور کبھی خود اپنی عقل سے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ باپ دادا جو کچھ کرتے تھے وہ درست اور معقول بھی تھا یا نہیں۔ اِس اندھی تقلید کے لیے کوئی دلیل اس کے سوا نہ تھی کہ یہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن نے تاریخ سے مثالیں پیش کیں کہ جب حضرت ہودؑ نے عاد کو ان کی بے راہ روی پر ٹوکا اور انہیں راہِ راست پر آنے کی تلقین کی تو اُنہوں نے صرف یہ کہہ کر اُن کی تمام دلیلوں اور نصیحتوں کو رد کر دیا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟" (الاعراف۔۷۰)۔ حضرت صالحؑ نے جب ثمود کو سمجھانے کی کوشش کی تو ان کا جواب یہ تھا کہ "اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان تُو ایسا شخص تھا جس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ جس طریقے کی طرف تو ہمیں بُلا رہا ہے اس کے بارے میں ہمیں سخت

شبہہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال دیا ہے" (ہود - ۶۲) حضرت شعیبؑ نے جب اہلِ مَدیَن کو ان کی صریح گمراہیوں پر متنبہ کیا تو ان کا جواب بھی یہی تھا کہ "اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (ہود - ۸۷) حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا کہ "یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟" تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے" - حضرت ابراہیمؑ نے اس پر ان سے صاف کہہ دیا کہ "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" (الانبیاء - ۵۲ تا ۵۴) حضرت ابراہیمؑ نے ان سے پوچھا کہ یہ تمہاری دعاؤں کو سنتے بھی ہیں؟ اور تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں؟ مگر ان کا جواب یہ تھا کہ ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں - ہم تو یہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے" (الشعراء - ۷۰ تا ۷۴) - حضرت موسیٰؑ نے جب کھلے کھلے معجزات کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو دعوتِ حق دی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟" (یونس - ۷۸) - ان مثالوں کو پیش کرتے ہوئے قرآن مجید نے بتایا کہ تمام جاہل قوموں نے اپنے انبیاء کی دعوت کو اسی حجتِ بے حجت سے رد کیا ہے - چنانچہ پہلی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سب ہی نے اپنے انبیاء کی صاف صاف دلیلوں، نصیحتوں اور فہمائشوں کا اگر کوئی جواب دیا تو یہ کہ "تم کچھ نہیں ہو مگر ہمارے ہی جیسے انسان، چاہتے ہو کہ ہم کو اُن معبودوں کی بندگی سے روک دو جنکی بندگی ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں" (ابراہیم - ۱۰) - دوسری جگہ فرمایا "اسی طرح اے نبی، تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی خبردار کرنے والا بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں - ہر نبی نے اُن سے پوچھا کیا تم اُسی ڈگر پر چلتے رہو گے خواہ میں اُس راستے سے زیادہ سیدھا راستہ تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس چیز کی طرف بُلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو ہم اُس کے کافر ہیں" (الزخرف ۲۳-۲۴) - اور یہ کچھ پچھلی قوموں ہی کا حال نہیں تھا بلکہ ہر زمانے کے جاہل لوگوں کا طریقہ یہی ہے اور رہا ہے کہ "وہ کسی علم اور ہدایت اور روشنی دکھانے والی کتاب کے بغیر اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس تعلیم کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم اُس طریقے

کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، خواہ شیطان اُن کے باپ دادا کو جہنم ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو" (لقمان - ۲۰-۲۱)۔

یہ مثالیں پیش کر کے قرآن نے براہ راست قریش اور اہلِ عرب کو متنبہ کیا کہ تم بھی انہی لوگوں کی طرح ہو۔ نہ خود اپنی عقل سے کام لے کر یہ سوچتے ہو کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو یہ صحیح بھی ہے یا نہیں اور نہ دلیل و حجت کے ساتھ تمہارے مذہب، رسوم اور اطوار کی جو غلطی تمہیں سمجھائی جاتی ہے اُس پر کچھ غور کرتے ہو۔ بس صرف اس وجہ سے ایک غلط چیز پر اصرار کر رہے ہو کہ یہ باپ دادا سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ سورۂ صافات میں فرمایا: "ان لوگوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا، لہٰذا یہ انہی کے پیچھے دوڑ چلے، حالانکہ ان سے پہلے اکثر گزرے ہوئے لوگ گمراہ ہو چکے تھے" (آیات ۶۹ تا ۷۱)۔ سورۂ ہود میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا" تم اُن معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہو جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ بس اُسی طرح عبادت کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے" (آیت ۱۰۹)۔ برہنگی و عریانی جیسی کھلی شرمناک بات پر جب قریش اور اہل عرب کو ٹوکا گیا اور انہیں اس بات پر شرم دلائی گئی کہ کعبہ کے گرد بھی وہ برہنہ طواف کرنے میں تامل نہیں کرتے جس سے زیادہ صریح گھناؤنا فعل کوئی نہیں ہو سکتا تو انہوں نے اسے بھی تقلید آبائی کی بنیاد پر جائز ٹھیرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے" جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ان سے کہو، اللہ بے حیائی کا کبھی حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کو تم نہیں جانتے کہ اللہ نے ان کا حکم دیا ہے؟ (آیت ۲۸)۔ کفارِ عرب طرح طرح کی غیر معقول جاہلانہ رسموں پر جمے ہوئے تھے اور بلا کسی دلیل کے یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ سب اللہ کی مقرر کردہ ہیں۔ اس کے متعلق سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا" اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس تعلیم کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے بس وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے جائیں گے خواہ وہ کوئی علم نہ رکھتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں؟ (آیت ۱۰۴)۔ اسی طرح کفارِ عرب نے حلال و حرام کی بہت سی خود ساختہ پابندیاں صرف اس دلیل سے اپنے اُوپر لازم کر لی تھیں کہ یہ پہلے سے چلی آرہی ہیں، اور ان میں بہت سی حلال چیزیں حرام، اور بہت سی حرام و شرمناک اور قبیح چیزیں حلال کر لی گئی تھیں۔ ان کے متعلق سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا کہ" جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اُس ہدایت کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں، نہیں، بلکہ ہم تو اُس طریقے کی پیروی کریں گے

جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اور کیا یہ انہی کی پیروی کیے جائیں گے خواہ ان کے باپ دادا نہ کسی چیز کی سمجھ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں؟" (آیت - ۱۷۰)

سورۂ انعام میں اس اندھی تقلید کو ایسے پُر زور طریقے سے نامعقول ثابت کیا گیا کہ عرب کے ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم لوگ بھی ایک دفعہ تو اپنے دلوں میں مان گئے ہوں گے کہ فی الواقع ہم نہایت ہی لغو باتوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ فرمایا:

"اِن لوگوں نے اللہ کے لیے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور جانوروں میں سے ایک حصہ مقرر کر رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کے لیے ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر جو اِن کے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا، مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ اِن کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے۔[۱] کیسے بُرے فیصلے ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے اُن کے شرکا نے خود اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ اُن کو ہلاکت میں ڈالیں اور اُن پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔[۲] ...... اور وہ کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور کھیتیاں محفوظ ہیں، اِن کو کوئی

---

[۱] یعنی جو غلے یا پھل وغیرہ اللہ کے نام پر نکالے جاتے تھے ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصے میں شامل کر دیا جاتا تھا، اور اگر شریکوں کے حصے میں سے گرتا یا خدا کے حصے میں مل جاتا تو اسے اُنھی کے حصے میں واپس کیا جاتا تھا۔ کھیت کا جو حصہ شریکوں کی نذر نیاز کے لیے مخصوص ہوتا تھا اگر اس میں سے پانی اُس حصے کی طرف پھوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصہ میں داخل کر دی جاتی تھی، لیکن اگر اس کے برعکس صورت پیش آجاتی تو خدا کے حصے میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا حصہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو خدا کا حصہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصے کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصے میں کچھ کمی آجاتی تو وہ خدا کے حصے سے پوری کی جاتی تھی لیکن خدا کے حصے میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصہ میں سے ایک حبّہ بھی خدا کے حصے میں نہ ڈالا جاتا۔

[۲] یعنی اُنھیں اس غلط فہمی میں ڈال دیں کہ یہ بھی اُسی دین کا کوئی حصہ ہے جو انہیں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام سے ملا تھا۔ اس مقام پر ظاہر ہے کہ شریکوں سے مراد دیوتا اور معبود نہیں بلکہ وہ مذہبی پیشوا ہیں جنھوں نے بعد کے دور میں غلط عقائد اور مذہبی رسوم کو رواج دیا اور لوگوں نے ان کی اس طرح پیروی کی جیسی خدا کے قانون کی کرنی چاہیے۔

نہیں کھا سکتا سوائے اُس کے جسے ہم کھلانا چاہیں، بزعمِ خود - اور کچھ جانور ہیں جن کی سواری و بار برداری حرام کر دی گئی ہے، اور کچھ جانور ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے اللہ پر افترا کرتے ہوئے (یعنی یہ جھوٹ گھڑتے ہوئے کہ اللہ نے ان پر اپنا نام لینے سے منع کر دیا ہے)....... اور کہتے ہیں کہ ان جانوروں کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام - لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو مرد اور عورت سب اس میں شریک ہیں......... یہ آٹھ نر و مادہ ہیں - دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے - اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے پوچھو کہ اللہ نے ان کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ذرا ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو - اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے - ان سے پوچھو ان کے نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں؟ کیا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا تمہیں حکم دیا تھا؟ پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط رہنمائی کرے - یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا" (آیات ۱۳۶ تا ۱۴۴) -

۲- بڑے لوگوں اور پیشواؤں کی غلط پیروی | تقلیدِ آبائی سے قریب تر ایک اور سببِ گمراہی کی قرآن نے نشاندہی کی جو لوگوں کو بگاڑنے اور معاشرے کو خراب کرنے میں اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور وہ ہے اپنی قوم، یا دنیا کے بڑے لوگوں، لیڈروں، مذہبی پیشواؤں، اور دولت مند سرداروں کی پیروی جو یہ دیکھے بغیر کہ وہ کدھر لیے جا رہے ہیں، صرف اس بنا پر کی جائے کہ وہ ہیں بڑے لوگ - قرآن نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ قیامت کے روز اِس طرح کی پیروی کرنے والے پچھتا پچھتا کر کہیں گے:

"اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ سے بے راہ کر دیا - اے ہمارے رب، ان کو دہرا عذاب دے اور اُن پر سخت لعنت کر" (الاحزاب - ۶۷-۶۸) -

"اے ہمارے پروردگار ہمیں اُن جنوں اور انسانوں کو دکھا جنہوں نے ہم کو

گمراہ کیا تھا، ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ ضرور ذلیل و خوار ہوں" (حٰم السجدہ - ۲۹)۔

"(جب اللہ تعالیٰ سزا دے گا) اُس وقت وہی پیشوا اور رہنما جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی اپنے پیروؤں سے لاتعلقی ظاہر کریں گے، مگر عذاب دیکھ کر رہیں گے اور اُن کے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے کہیں گے کہ کاش ہم کو ایک موقع پھر مل جاتا تو ہم ان سے اُسی طرح بیزار ہو کر دکھا دیتے جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں۔ یوں اللہ ان لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں ان کے سامنے اِس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں سے ہاتھ ملتے رہیں گے۔ مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے" (البقرہ - ۱۶۶، ۱۶۷)۔

"کاش تم اِن ظالموں کا حال اُس وقت دیکھو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور ایک دوسرے سے دُو بدُو جھگڑا کریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے "تم نہ ہوتے تو ہم مسلمان ہوتے"۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں سے کہیں گے کہ "کیا ہم نے تم کو ہدایت قبول کرنے سے روکا تھا جبکہ وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ تم تو خود ہی مجرم تھے"۔ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے "نہیں، بلکہ وہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیرائیں"۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے" (سبا - ۳۱ تا ۳۳)

اِس حقیقت کو قرآن نے بطورِ ایک عالمگیر قانون کے بیان کیا کہ کسی معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوشحال اور اُونچے طبقوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اس کے دولت مند اور صاحب اثر و اقتدار لوگ فسق و فجور پر اُتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَنْ نُّهْلِكَ
قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا
فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا
الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيرًا۔
(آیت - ۱۶)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں فسق کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اُس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

۳ - غرور و تکبر تیسرا اہم سببِ ضلالت جس کی قرآن نے نشان دہی کی وہ یہ ہے کہ انسان حق بات ماننے سے صرف اس لیے انکار کرتا ہے کہ اُسے اپنے رویہ کی غلطی تسلیم کرنے میں اپنی ہیٹی ہوتی نظر آتی ہے، یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اِس حق کو تسلیم کر لوں گا تو گمراہ معاشرے میں جو اُونچا مقام مجھے حاصل ہے وہ مجھ سے چھن جائے گا، یا وہ خیال کرتا ہے کہ اپنی بات چھوڑ کر دوسرے کی بات مان لینا اُس کے مقامِ بلند سے فروتر ہے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ بات کتنی ہی غلط ہو جس پر وہ اڑا ہوا ہے اور وہ بات کتنی ہی برحق ہو جسے دوسرا شخص پیش کر رہا ہے۔ قرآنِ مجید میں اس سببِ ضلالت کو بار بار لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تاکہ اُن کا اپنا غرور بھی ٹوٹے جو قبولِ حق میں مانع ہو رہا تھا، اور اُن کے بہت سے علمبردارانِ ضلالت کی گمراہی کے اصل سبب سے بھی وہ واقف ہو جائیں جو اُن کے اپنے زمانے میں، یا اُن سے پہلے گذرے ہوئے زمانے میں حق کا راستہ روکنے والے تھے۔

مثال کے طور پر سورۂ نوح میں حضرت نوحؑ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ "اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز (راہِ حق کی طرف آنے کے لیے) پکارا، مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو دعوت دی تاکہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبّر کیا" [۱] (آیات ۶-۷)

سورۂ المومن میں یہ قصہ بیان کیا گیا کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا اِرادہ ظاہر کیا تو اُسی کے اہلِ دربار میں سے ایک حق پسند آدمی نے بڑے دردمندانہ اور خیرخواہانہ انداز میں نہایت مدلّل طریقے

---

[۱] تکبّر سے مراد یہ ہے کہ اُنہوں نے حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کرنے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے اور وہ جواب میں سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہو اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جائے تو یہ تکبّر کے ساتھ کلامِ نصیحت کو رد کرنا ہو گا۔

سے اُس کو سمجھانے اور غلط رویہ چھوڑ کر راست روی اختیار کرنے کی تلقین کی۔ مگر اُس نے اِن باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ — اِس طرح اللہ ٹھپہ لگا دیتا ہے ہر متکبر و جبار کے دل پر۔

(آیت ۳۵)

یعنی تکبر اور جبّاریت کی ہوا جس دل میں بھر جاتی ہے پھر اُس کے دروازے ہر کلمۂ نصیحت اور ہر قولِ حق کے لیے بند ہو جاتے ہیں اور اللہ پھر اُس پر لعنت کی ایسی مہر لگا دیتا ہے کہ خواہ کوئی اسے راہ راست پر لانے کی کتنی ہی کوشش کرلے، وہ کسی طرح سیدھا نہیں ہوتا۔

سورۂ اعراف میں بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جب تختیوں پر ایک ہدایت نامہ لکھ کر دیا تو اس کے ساتھ ہی متنبہ فرمادیا کہ "میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو کسی حق کے بغیر زمین میں تکبر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، کبھی اُس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اُسے اختیار کرلیں گے" (آیت ۱۴۶)۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا "انسانوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تم کو بہت بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھیراتا ہے، مگر وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔ یہ باتیں بنا کر جب وہ پلٹتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ فساد برپا کرنے اور کھیتیوں اور نسلوں کو برباد کرنے میں صرف ہوتی ہے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا گھمنڈ اس کو گناہ پر جما دیتا ہے" (آیات ۲۰۴ تا ۲۰۶)۔

سورۂ مدّثر میں خود مکہ کے ایک سردار کا کردار پیش کیا گیا جس نے قریش کے سرداروں کے سامنے صاف صاف اعتراف کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات وہ لگا رہے ہیں وہ جھوٹے ہیں، اور قرآن ایک ایسا کلام ہے جس میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری ہے اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں، مگر جب اُس کے سامنے یہ سوال آیا کہ اس رسول اور اِس کلام کو حق مان کر میں اپنی سرداری کھو بیٹھوں۔ یا اس پر جھوٹا الزام لگا کر اپنی سرداری بچالوں، تو اُس نے دوسری چیز کو ترجیح دی اور اپنے ضمیر سے لڑ کر آخر کار ایک الزام تصنیف کر ڈالا جسے اس کا دل خود جانتا تھا کہ وہ محض اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لیے ایک صریح

جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ قرآن نے اُس کی یہ تصویر پیش کر کے اُسے بالکل بے نقاب کر دیا:

"اُس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، تو خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ تو ایک انسانی کلام ہے" (آیات ۱۸ تا ۲۵)۔

۴۔ دنیا کی خوشحالی و بدحالی کو خیر و شر کا معیار سمجھنا پھر قرآن نے بتایا کہ گمراہی کا ایک اور بڑا سبب یہ خیال ہے کہ دنیا میں جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہی معیار خیر و شر ہیں۔ یہاں اگر کوئی خوشحال ہے، خواہ اُس کی خوشحالی کیسی ہی بدکرداریوں کا نتیجہ ہو، وہ کامیاب ہے، اور یہاں جو خستہ حال ہے، خواہ اس کی خستہ حالی کیسی ہی نیک عملی کے ساتھ ہو، وہ بہرحال ناکام ہے۔ گویا خیر وہ ہے جس کا نتیجہ یہاں بظاہر اچھا نظر آرہا ہے، اور شر وہ ہے جس کا نتیجہ یہاں بظاہر بُرا دیکھا جارہا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس ظاہری "خیر" کے پیچھے کتنی ہی حرام خوریاں اور بداخلاقیاں پائی جاتی ہوں، اور وہ "شر" اپنے پیچھے کتنا ہی حسنِ عمل اور بلندیِ اخلاق کا سرمایہ رکھتا ہو۔ قرآن نے اس غلط نقطۂ نظر کی مثالیں پچھلی تاریخ سے بھی پیش کیں، اور خود مکہ اور عرب کے لوگوں کی گفتار و کردار میں بھی اس کو نمایاں کر کے دکھایا۔

حضرت نوحؑ کے قصہ میں بتایا کہ اُن کی قوم کے سرداروں نے یہ کہہ کر ان کی تعلیم و ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا کہ اُن پر ایمان لانے والے غریب لوگ تھے جنہیں معاشرہ میں کوئی بلند مرتبہ حاصل نہ تھا۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ۔ "اُنہوں نے کہا کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی ادنیٰ ترین لوگوں نے کی ہے"۔ (الشعراء، آیت ۱۱۱)۔

حضرت صالحؑ کے قصے میں قرآن نے صراحت کی کہ اُن کے غریب پیروؤں سے ان کی قوم کے بڑے لوگوں نے کہا اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" انہوں نے کہا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۔ "ہم تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں"۔ اس پر اُن بڑے لوگوں نے کہا اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔ "ہم اُس چیز کو ماننے والے نہیں جس پر تم ایمان لائے ہو" (الاعراف ۷۵-۷۶)۔ یعنی تم جیسے حقیر لوگوں نے جس چیز کو مانا ہے اسے ہم نہیں مان سکتے۔

پھر تمام انبیاء کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ اُن سب کے مخالف اُن کی قوم کے خوشحال لوگ تھے اور ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جس کو دنیا میں خوب مال و اولاد نصیب ہے وہی حق پر ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (سبا ۳۴-۳۵)

اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اُس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو ماننے والے نہیں۔ اور انہوں نے کہا ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔

یہی سوچنے کا انداز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفارِ مکہ اور اہلِ عرب کا تھا جس کے غلط ہونے پر قرآن مجید میں بار بار اُن کو ٹوکا گیا۔ سورہ مریم میں فرمایا "ان لوگوں کو جب ہماری کھلی کھلی آیات سُنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں شاندار ہیں؟ حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے زیادہ سروسامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان وشوکت میں ان سے بڑھی ہوئی تھیں" (آیات ۷۳-۷۴)۔ سورہ مومنون میں فرمایا "کیا یہ لوگ اس خیال میں ہیں کہ ہم جو اِن کو مال اور اولاد سے نوازے جا رہے ہیں تو انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے۔ درحقیقت جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں، اور جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، اور جن کا حال یہ ہے کہ (اپنے رب کی خوشنودی کے لیے) جو نیک کام وہ بجا لاتے ہیں اُن کے بعد بھی اُن کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، وہی دراصل بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کرکے انہیں پالینے والے ہیں" (آیات ۵۵ تا ۶۱)۔ اِسی بات کو سمجھانے کے لیے سورہ فجر میں پہلے عاد اور ثمود اور فرعون جیسی زبردست ترقی یافتہ قوموں اور سلطنتوں کی طغیانی و سرکشی کا انجام بیان کیا اور پھر فرمایا کہ انسان اب بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ دنیا کی نعمت و دولت ہی اصل عزت ہے اور یہاں کی غربت و تنگ دستی ہی اصل ذلت ہے، حالانکہ نعمت و دولت ہو یا غربت و تنگ دستی، دونوں ہی انسان کی آزمائش کے لیے ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی اصل عزت و ذلت کا معیار نہیں ہے (ملاحظہ ہو الفجر، آیات ۱۵-۱۶)۔

۵۔ خواہشِ نفس اور قیاس و گمان کی پیروی گمراہی کے اسباب بتاتے ہوئے قرآن نے ایک اور اہم سبب کی بھی نشاندہی کی اور وہ یہ کہ انسان محض قیاس و گمان کی بنا پر کسی چیز کو حق اور کسی دوسری چیز کو باطل سمجھ بیٹھے، یا اپنی خواہشات نفس کو اپنا خدا بنا کر اُن کی ایسی بندگی کرے کہ جدھر جدھر وہ چاہیں اُسے گھسیٹے لیے پھریں، مگر کبھی خدا کی دی ہوئی عقل اور اس کے بخشے ہوئے ذرائع علم سے کام لے کر وہ یہ نہ دیکھے کہ اپنے گمانوں اور قیاسات کی بنا پر اُس نے جو راستہ اختیار کیا ہے، یا اپنی خواہشات کی پیروی میں وہ جس راہ پر چلا جا رہا ہے وہ صحیح اور معقول بھی ہے یا نہیں۔ اِس غلطی پر قرآن نے بار بار لوگوں کو متنبہ کیا تاکہ وہ خیالات اور خواہشات کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے عقل و خرد کی سیدھی راہ پر آئیں۔

سورۂ اعراف میں ایک شخص کی مثال پیش کی گئی جو علم رکھنے کے باوجود خواہشاتِ نفس کی پیروی میں دنیا کا کُتا بن کر رہ گیا تھا، پھر اُس جیسے لوگوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: "ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں۔ اُن کے پاس دل ہیں، مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں۔ اُن کے پاس آنکھیں ہیں، مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں، مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں" (آیات ۱۷۳ تا ۱۷۹)۔

سورۂ انفال میں اُن لوگوں کا ذکر کیا گیا جو سب کچھ سُننے کے بعد بھی گویا کچھ نہ سُنتے تھے، اور پھر فرمایا: "درحقیقت اللہ کے نزدیک تمام جاندار مخلوقات میں سے بدترین مخلوق وہ بہرے اور گونگے ہیں جو ذرا عقل سے کام نہیں لیتے" (آیت ۲۲)۔ بہرے اور گونگے سے مراد جسمانی بہرے اور گونگے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو نہ حق سُنتے ہیں اور نہ حق بولتے ہیں۔

سورۂ یونس میں آیت ۳۱ سے ۳۵ تک پے درپے یہ دلائل دینے کے بعد کہ جن جن معبودوں کو مشرکین نے خدائی میں ربِ کائنات کا شریک بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی بھی خدائی صفات اور اختیارات نہیں رکھتا، صاف فرمایا گیا کہ اُن کو معبود کسی علم کی بنا پر نہیں بنایا گیا ہے بلکہ محض گمان و قیاس سے اپنی جگہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ بھی خدائی میں کچھ حصہ رکھتے ہیں۔ "ان میں سے اکثر لوگ گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا" (آیت ۳۶)۔

سورۂ حج میں پچھلی گذری ہوئی غلط کار قوموں کی تباہی کے آثار کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا "کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ (اُن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈر دیکھ کر) ان کے دل سمجھنے والے

یا اِن کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں" (آیت ۴۶)

اسی طرح سورۂ فرقان میں قومِ نوح، عاد، ثمود، اصحاب الرّس، قومِ فرعون اور قومِ لوط کے انجام کی طرف توجہ دلانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمّہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا عقل سے کام لیتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے" (آیات ۴۳-۴۴)

یہی بات سورۂ جاثیہ میں بھی فرمائی کہ "اے نبی، کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس ہی کو اپنا خدا بنا لیا اور علم کے باوجود اللہ نے اسے گمراہی میں پھینک دیا، اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اب اللہ کے بعد اور کون ہے جو اُسے ہدایت دے"؟ (آیت ۲۳)

۶- بُرائی کو خوبی سمجھنا اور غیرِ حق پر مگن رہنا ایک اور چیز کو جس کو قرآن نے افراد اور معاشرے کی گمراہی کے بڑے اسباب میں شمار کیا وہ یہ تھی کہ انسان بُرے کاموں کو اچھا سمجھنے لگے، حق کے خلاف چلتے ہوئے مرے سے کوئی بے اطمینانی محسوس ہی نہ کرے، بلکہ اُلٹا اُس پر مگن ہو، اُس پر اترائے، اور حق جاننے کی ضرورت سے بالکل بے نیاز ہو۔ چنانچہ سورۂ فاطر میں فرمایا "بھلا کچھ ٹھکانا بھی ہے اُس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اُس کا بُرا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اُسے اچھا سمجھ رہا ہو" (آیت ۸)۔ اور سورۂ مومن میں فرمایا کہ "جہنم میں جب لوگوں کو عذاب دیا جا رہا ہو گا اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارا انجام اس سبب سے ہوا کہ تم زمین میں غیرِ حق پر مگن تھے اور اُس پر اتراتے تھے" (آیت ۷۵)۔

۷- یہ خیال کہ نیکی اور حق پرستی سے انسان کی دنیا برباد ہو جاتی ہے قرآن مجید میں اِس خیال کو بھی ایک بڑا سببِ گمراہی بتایا گیا۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے اور قافلے لوٹنے اور رہزنی کرنے سے روکا تو قوم کے سرداروں نے لوگوں سے کہا کہ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۔ "اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو تم یقیناً تباہ ہو جاؤ گے" (آیت ۹۰)۔ گویا اُن کا مطلب یہ تھا کہ بھلا کہیں تجارت میں ایمانداری برتنے سے بھی کاروبار چل سکتا ہے؟ اور ہم جو تجارتی قافلوں کے راستے پر آباد ہیں، اگر رہزنی نہ کریں، اور راستوں کو پُرخطر بنا کر قافلوں سے بھاری

رہگذر وصول نہ کریں تو ہماری یہ خوشحالی کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ یہی بات قریش کے سرداروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھی کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا۔ "اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو ہم اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے" (القصص - ۵۷)۔ یعنی ہمارا جو کچھ اثر عرب کے لوگوں پر ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ ہم یہاں مشرکینِ عرب کے مذہبی پیشوا بنے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری تجارت چمک رہی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے قافلوں کو سارے ملک کے راستوں میں امن میسر ہے۔ اور اسی وجہ سے عرب کے تمام قبائل ہمارا احترام کرتے ہیں۔ اگر ہم آپ کی بات مان کر وہ راہ اختیار کرلیں جو آپ پیش کر رہے ہیں تو سارا عرب ہمارا مخالف ہو جائے گا، جو حیثیت ہمیں ملک میں حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی، اور ہمارا مکے میں بھی امن چین سے رہنا ممکن نہ رہے گا۔

۸۔ **شفاعت کا مشرکانہ عقیدہ** یہ قدیم ترین زمانے سے ہر دور میں گمراہی کا ایک بڑا سبب رہا ہے اور عرب میں جب اسلام کی دعوت اُٹھی تو اُس کو بھی اِس سے سابقہ پیش آیا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے کچھ پیارے بندے ایسے ہیں جن کی بات کسی طرح نہیں ٹل سکتی۔ اُن کا دامن آدمی تھام لے، نذر نیاز اور پوجا پاٹ سے اُن کو خوش کرتا رہے، پھر دنیا میں جو چاہے کرے، اُن کی سفارش ہر جرم و گناہ کی سزا سے اُسے بچالے گی۔ اللہ کی بخشش اور مہربانیاں حاصل کرنے اور اپنے دل کی مرادیں پانے کا یہ آسان راستہ موجود ہوتے ہوئے کسی کو کیا پڑی ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی بیڑیاں اپنے پاؤں میں ڈال کر ہر گناہ کی لذت اور ہر ظلم و زیادتی کے فائدے سے اپنے آپ کو محروم کرے۔ کفارِ عرب کا کہنا یہ تھا کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى "ہم تو اُن کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں" (الزمر-۳)۔ یعنی اللہ کی بارگاہ بہت اونچی ہے۔ اُس تک براہ راست ہماری پہنچ کہاں ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہم ان بزرگ ہستیوں کو اُس تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ نیز وہ کہتے تھے کہ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ "یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں" (یونس ۱۸)۔

اس غلط عقیدے کی موجودگی میں نیکی اور بھلائی کی کوئی دعوت کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے قرآن میں پے در پے اس پر ضرب لگائی گئی اور اس کا سراسر بے بنیاد ہونا ایسے دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا گیا کہ کسی معقول آدمی کے لیے ایسی احمقانہ شفاعت کا قائل ہونا ممکن نہ رہا۔ مثلاً سورۂ مومن میں فرمایا: "اے نبی، اِن لوگوں کو اُس دن سے ڈرا دو جو قریب آلگا ہے، جبکہ کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ

پیے کھڑے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ رہے وہ معبود جنہیں یہ لوگ اُسے چھوڑ کر پکار رہے ہیں، تو وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ حقیقت میں اللہ ہی سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا ہے" (آیات ۱۸ تا ۲۰)۔ اِن آیات میں شفاعت کے اِس مشرکانہ عقیدے کو بالکل پاش پاش کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اوّل تو بجائے خود یہ بات خلافِ عقل و انصاف ہے کہ ظالم کی سفارش کی جائے۔ پھر یہ خدا کی شانِ خدائی کے قطعی خلاف ہے کہ اُس کے بندوں میں سے کوئی ایسا سفارشی ہو جس کی اطاعت کی جائے، یعنی خدا اُس کی سفارش ماننے پر مجبور ہو۔ اس پر مزید یہ بات کسی طرح تصور تک کرنے کے لائق نہیں ہے کہ خدا کے ہاں ایسے لوگوں کی سفارش چلے جو دنیا میں ظلم کر کے آنے والے مجرم کی حمایت پر اُٹھیں اور یہ چاہیں کہ خدا اُس کو اُن کی خاطر معاف کر دے۔ اِس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ ایک حاکم جو کسی شخص کے جرائم سے خوب واقف ہے اور جس کو انصاف کے ساتھ اُس کے مقدمے کا فیصلہ کرنا ہے، وہ ایسے لوگوں کو اُس کی سفارش کا حق دے دے جو یہ جانتے ہی نہیں کہ وہ شخص کیا کچھ کر کے آیا ہے۔

دوسری جگہ اِس تصورِ شفاعت کی تردید ایک اور پُر زور دلیل سے کی گئی ہے۔ فرمایا: "اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ (اس کا دعوٰی کرنے والے) حق کے ساتھ شہادت دیں اور وہ جانتے ہوں" (الزُّخرُف - ۸۶)۔ یعنی جو شخص کسی دیوی، دیوتا یا بزرگ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اُسے لازماً شفاعت کے اختیارات حاصل ہیں اور اس کو ایسی شفاعت کا اختیار ہے جو رد نہیں کی جاسکتی، وہ سامنے آئے اور علم کی بنا پر اس بات کی برحق شہادت دے۔ محض سُنی سُنائی باتوں پر، یا محض قیاس و وہم و گمان پر ایسا ایک عقیدہ مان لینا سراسر لغو ہے جس کے "حق ہونے کی شہادت علم کی بنا پر" نہیں دی جاسکتی۔ بالفاظِ دیگر جو لوگ کچھ ہستیوں کے لیے ایسے اختیارات کا دعوٰی کر رہے ہیں وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو "معلوم" ہے کہ اُنھیں یہ اختیارات حاصل ہیں اور ہم اس کی سچی "شہادت" دیتے ہیں۔

لیکن قرآن نے شفاعت کا قطعی انکار نہیں کیا، بلکہ بار بار یہ بتایا کہ شفاعت صرف وہ کرسکتا ہے جس کو اللہ نے اس کی اجازت دی ہو، اور صرف اُس کے حق میں کرسکتا ہے جس کے لیے شفاعت سُننے پر اللہ راضی ہو، اور اِس پر مزید شرط یہ ہے کہ وہ حق کے مطابق شفاعت کرے، خلافِ حق و انصاف بات نہ کرے۔ پھر بھی شفاعت قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کے اختیار میں ہے، وہ ہرگز کسی کی شفاعت ماننے پر مجبور نہیں ہے۔ اِس

باب میں قرآن کی تصریحات یہ ہیں:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ - ۲۵۵)	کون ہے جو اس کے حضور اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرسکے؟
وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۔ (سبا - ۲۳)	اور اس کے حضور شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی سوائے اُس شخص کے جس کے لیے اُس نے اجازت دی ہو۔
یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (النبا - ۳۸)	جس روز رُوح (یعنی جبریل) اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جسے رحمان نے اجازت دی ہو اور وہ ٹھیک بات کہے۔
قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ، لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (الزمر - ۴۴)	اے نبی، کہہ دو کہ شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے۔

یعنی شفاعت سننا یا نہ سننا اور اسے قبول کرنا یا رد کر دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ کائنات کی بادشاہی کا مالک ہے۔ کسی کی یہ مجال نہیں کہ اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے، اور کسی کا یہ مرتبہ نہیں کہ اُس کی شفاعت اللہ کو ضرور سننی اور ماننی ہی پڑے۔

(باقی)

دعوتِ اسلامی کی کامیابی کا راستہ

تربیت گاہِ جماعتِ اسلامی میں سوال وجواب کی ایک محفل

پچھلے دنوں لاہور میں صوبۂ پنجاب کے ارکانِ جماعت کی ایک تربیت گاہ چند روز کے لیے قائم ہوئی تھی جس میں ہر ضلع کے چیدہ ارکان شریک ہوئے تھے۔ ۳۰ مارچ کی شام کو اس میں مجھے شرکاء تربیت گاہ کے سوالات کا جواب دینے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس میں جو سوالات کیے گئے اور ان کے جو جوابات دیے گئے انہیں یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

ابوالاعلیٰ

اَن پڑھ لوگوں میں تبلیغ کیسے کی جائے

سوال:۔ "۸۰ فیصد اَن پڑھ لوگوں کو دعوتِ اسلامی سے کیسے روشناس کرایا جائے"۔

جواب:۔ اسلام کی دعوت جب عرب میں پیش کی گئی تھی اُس وقت اُس کی مخاطب آبادی تقریباً سو فیصدی اَن پڑھ تھی۔ قریش جیسے ترقی یافتہ قبیلے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں صرف سترہ افراد پڑھے لکھے تھے۔ مدینے میں اِس سے بھی کم لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ اور باقی عرب کی حالت کا اندازہ آپ اِن دو بڑے شہروں کی حالت سے کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید اُس ملک میں لکھ کر نہیں پھیلایا گیا تھا بلکہ وہ لوگوں کو زبانی سُنایا جاتا تھا۔ صحابۂ کرام اُس کو سُن کر ہی یاد کرتے تھے اور پھر زبانی ہی اُسے دوسروں کو سُناتے تھے۔ اِسی ذریعہ سے پورا عرب اسلام سے روشناس ہوا۔ پس درحقیقت لوگوں کا اَن پڑھ ہونا کوئی ایسی دشواری نہیں ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ نہ ہو سکتی ہو۔ آغازِ اسلام میں اِس دین کی تبلیغ اَن پڑھ لوگوں ہی میں کی گئی تھی اور یہ محض زبانی تبلیغ وتلقین ہی تھی جس سے اُن کو اس قدر بدل دیا گیا، ایسا زبردست انقلاب اُن کے اندر برپا کر دیا گیا کہ وہ دنیا کے مصلح بن کر کھڑے ہو گئے۔ اب آپ کیوں

یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ۸۰ فیصد ان پڑھ آبادی میں اسلام کی دعوت نہیں پھیلائی جا سکتی؟ آپ کے اندر ۲۰ فی صدی تو پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ پڑھ کر اسلام کو سمجھیں، اور پھر باقی ۸۰ فی صد لوگوں کو زبانی تبلیغ و تلقین سے دین سمجھائیں۔ پہلے کی بہ نسبت اب یہ کام زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ البتہ فرق جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ اُس وقت جو شخص بھی اسلام کی تعلیمات کو سُن کر ایمان لاتا تھا وہ ایمان لا کر بیٹھ نہیں جاتا تھا بلکہ آگے دوسرے بندگانِ خدا تک اِن تعلیمات کو پہنچانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اُس کی تمام حیثیتوں پر مبلغ ہونے کی حیثیت غالب آ جاتی تھی۔ وہ ہمہ تن ایک تبلیغ بن جاتا تھا۔ جہاں جس حالت میں بھی اُسے دوسرے لوگوں سے سابقہ پیش آتا تھا، وہ ان کے سامنے اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات بیان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ وہ ہر وقت اِس تلاش میں لگا رہتا تھا کہ کس طرح اللہ کے بندوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں لائے۔ جتنا قرآن بھی اُسے یاد ہوتا وہ اُسے لوگوں کو سُناتا، اور اسلام کی تعلیمات جتنی کچھ بھی اسے معلوم ہوتیں اُن سے وہ لوگوں کو آگاہ کرتا تھا۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ صحیح عقائد کیا ہیں جو اسلام سکھاتا ہے اور باطل عقیدے اور خیالات کون سے ہیں جن کی اسلام تردید کرتا ہے۔ اچھے اعمال اور اخلاق کیا ہیں جن کی اسلام دعوت دیتا ہے اور برائیاں کیا ہیں جن کو وہ مٹانا چاہتا ہے۔ یہ سب باتیں جس طرح پہلے سُنائی اور سمجھائی جاتی تھیں اُسی طرح آج بھی سُنائی اور سمجھائی جا سکتی ہیں۔ اِن کے لیے نہ سُنانے والے کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے نہ سننے والے کا۔ یہ ہر وقت بیان کی جا سکتی ہیں اور ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ اسلام نے کوئی ایسی نرالی چیز پیش ہی نہیں کی ہے جس سے انسانی طبائع مانوس نہ ہوں اور جن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے بڑے فلسفے گھارنے کی ضرورت ہو۔ یہ تو دینِ فطرت ہے۔ انسان اِس سے بالطبع مانوس ہے۔ اِسے پڑھے لکھے لوگوں کی بہ نسبت اَن پڑھ لوگ زیادہ آسانی سے قبول کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ فطرت سے قریب تر ہوتے ہیں، اور ان کے دماغ میں وہ پیچ نہیں ہوتے جو جاہلیت کی تعلیم نے ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کے دماغوں میں ڈال دیے ہیں۔ لہٰذا آپ اَن پڑھ آبادی کی کثرت سے ہرگز نہ گھبرائیں۔ اُن کی ناخواندگی اصل رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ آپ کے اندر جذبۂ تبلیغ کی کمی اصل رکاوٹ ہے۔ ابتدائے اسلام کے مسلمانوں کی طرح ہمہ تن مبلغ بن جائیے اور تبلیغ کی وہ لگن اپنے اندر پیدا کر لیجیے جو ان کے اندر تھی۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اسلام کی دعوت پھیلانے کے بے شمار مواقع آپ کے منتظر ہیں جن سے آپ نے آج تک اس لیے فائدہ نہیں اُٹھایا کہ آپ اپنے ملک کی آبادی میں سو فی صدی خواندگی پھیل جانے کے منتظر رہے۔

آئندہ انتخابات میں جماعت اسلامی کی پالیسی کیا ہو؟

سوال:۔ "آئندہ عام انتخابات میں جماعت اسلامی کی انتخابی پالیسی کیا ہونی چاہیے"؟

جواب:۔ اس سوال کا جواب میں آپ کو یہاں نہیں دے سکتا۔ اس کے متعلق اگر مجھے کچھ کہنا ہوگا تو امیر جماعت سے کہوں گا، یا مجلسِ عاملہ مجھ سے دریافت کرے گی تو اس کے سامنے بیان کروں گا، یا مجلس شوریٰ مجھ سے پوچھنا چاہے گی تو اُس کے اجلاس میں پیش کروں گا۔ میں ایک عام رُکن جماعت ہوں۔ نہ امیر جماعت ہوں، نہ مجلسِ عاملہ کا رُکن، نہ مجلس شوریٰ کا رکن۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ یہاں بیٹھ کر جماعت کی پالیسی طے کروں۔ پالیسی طے کرنا اُن لوگوں کا کام ہے جو دستور کی رُو سے اِس کے مجاز ہیں۔ کسی معاملہ میں میری جو رائے بھی ہوگی اُسے اُن تک پہنچا دوں گا، پھر یہ اُن کی صواب دید پر موقوف ہے کہ جو پالیسی چاہیں بنائیں۔

چوہدری غلام جیلانی صاحب۔ "لیکن مولانا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ سب کچھ ہیں"۔

جواب:۔ میں اِس تصوّر کی جڑ کاٹ دینا چاہتا ہوں۔ یہ جماعت ایک دستور اور ایک نظام پر قائم ہے۔ اِس میں مجھ سمیت کوئی شخص بھی اپنی ذاتی حیثیت میں "سب کچھ" نہیں ہو سکتا۔ جس روز جماعت کی تاسیس ہوئی تھی اُسی روز میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ دعوت تو بلاشبہ میں نے دی ہے، مگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جو شخص داعی ہے اُسی کو آپ سے آپ امیر جماعت بھی ہونا چاہیے۔ میرا کام آپ کو اقامت دین کے لیے جمع کر دینا تھا سو وہ میں نے کر دیا۔ اب یہ طے کرنا آپ کا کام ہے کہ یہ ذمہ داری کس کے سپرد کریں۔ اُس وقت چونکہ ارکانِ جماعت نے امارت کا بار میرے اُوپر ہی رکھ دیا اس لیے میں نے اسے اُٹھا لیا۔ اب میری خرابیِ صحت نے مجھے اِس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ اِس ذمہ داری کا حق ادا کر سکوں، اس لیے میں نے ایمانداری کے ساتھ اپنے آپ کو اِس سے سبکدوش کرا لیا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی ذمہ داری میں اپنے سر کیسے لے لوں جبکہ نظامِ جماعت کی رُو سے اب میں اُس کا حامل نہیں رہا ہوں؟ البتہ خادمِ جماعت ہونے کی حیثیت سے میرا جو فرض ہے اُسے جب تک زندہ ہوں انشاءاللہ ادا کرتا رہوں گا۔

کیا اقامتِ دین کا کام ظہورِ مہدی سے پہلے ہو سکے گا؟

سوال:۔ "کیا اقامتِ دین ایک فرض ہے جسے ہر زمانے اور ہر حال میں ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اور کیا قرآن و حدیث میں کہیں یہ بات ملتی ہے کہ ظہورِ مہدی سے قبل اسلامی نظام قائم ہو سکے گا"۔

جواب:- قرآن میں تو خیر ظہورِ مہدی کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ احادیث میں اس کا ذکر ضرور آیا ہے۔ مگر وہ بس اسی حد تک ہے کہ مہدی آئیں گے اور دنیا کو، جو ظلم سے بھر چکی ہوگی، عدل سے بھر دیں گے۔ اس خوشخبری سے آخر یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ جب تک وہ نہ آئیں اُس وقت تک دنیا ظلم سے بھرتی رہے اور ہم اس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ شیاطین کے دین قائم ہوتے رہیں اور اللہ کا دین قائم کرنے کے لیے ہم امام مہدی کی تشریف آوری کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ یہ تعلیم نہ اللہ نے دی ہے، نہ اللہ کے رسول نے۔ اور قرآن و حدیث میں یہ بھی کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ امام مہدی کی آمد سے پہلے اللہ کا دین کبھی قائم نہ ہو سکے گا، یا اُسے قائم کرنے کی کوشش کا فریضہ مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط رہے گا۔ یہ بات ایک بشارت تو ضرور ہو سکتی ہے کہ آئندہ کسی زمانے میں کوئی ایسی عظیم شخصیت اُٹھے گی جو تمام عالم میں اسلام کا جھنڈا بلند کرے گی، مگر یہ کوئی حکمِ امتناعی نہیں ہو سکتی کہ ہم دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کچھ نہ کریں۔ رہا یہ سوال کہ اقامتِ دین فرض ہے یا نہیں، تو کوئی ایسا شخص جو قرآن و حدیث کو جانتا ہے، اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء بھی بھیجے ہیں اپنا دین قائم کرنے ہی کے لیے بھیجے ہیں، کوئی ایک نبی بھی لوگوں کو یہ سکھانے کے لیے نہیں بھیجا کہ وہ غیر اللہ کا دین قائم کرنے والوں کے ماتحت بن کر رہیں۔ سورۂ شوریٰ دیکھیے، اس میں حضورؐ سمیت تمام انبیاء کا فرض یہ بیان کیا گیا ہے کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ۔ "اس دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔" سورۂ توبہ، سورۂ فتح اور سورۂ صف میں دیکھیے۔ تین مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ پورے دین پر اُسے غالب کر دے"۔ اب کون یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ اُمّتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود نبیِؐ برحق کے مقصدِ بعثت سے مختلف بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

عوامی رجحانات کو دیکھتے ہوئے ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟

سوال:- "پاکستان کے موجودہ حالات میں عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری سیاسی حکمتِ عملی کیا ہونی چاہیے؟"

جواب:- یہ سوال بھی اگرچہ اُسی نوعیت کا ہے جس کا جواب اس مجلس میں دینے سے میں اظہارِ معذرت

کر چکا ہوں، لیکن چونکہ اِس سوال میں پوچھا یہ گیا ہے کہ "پاکستان کے موجودہ حالات میں عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے" ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہیے، اس لیے میں اس کا ایک اُصولی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ ہمارے رفقاء کسی غلط طرزِ فکر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم جس ملک میں، جس قوم میں، جس زمانے میں، اور جن حالات میں کام کر رہے ہیں، ہمیں کوئی پروگرام بناتے ہوئے اُن سب کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ لیکن ہماری اُصولی دعوت لازماً ایک ہی رہے گی، ہمارا بنیادی مقصد بھی قطعاً ناقابلِ تغیر ہوگا، اور اپنا عملی پروگرام بناتے ہوئے ہم اِن چیزوں کو صرف اِس حیثیت سے ملحوظ رکھیں گے کہ اِس ملک اور اِس زمانے کے حالات میں ہم اپنی دعوت کو کس طریقے سے فروغ دیں، اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اِس قوم کے اچھے رُجحانات سے کس طرح فائدہ اُٹھائیں، اور اِس کے بُرے رجحانات کو کس طرح بدلیں کہ وہ ہمارے مقصد کی راہ میں کم از کم رکاوٹ تو نہ بن سکیں۔ اس نقطۂ نظر سے اِن چیزوں کو ملحوظ رکھنا تو عین تقاضائے حکمت ہے لیکن اگر ہم زمان و مکان کے حالات اور لوگوں کے رُجحانات کو دیکھ کر اپنی دعوت اور اپنے مقصد ہی پر نظرِ ثانی کرنے بیٹھ جائیں تو یہ سراسر گمراہی ہے جس کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ آنا چاہیے۔ طریقِ کار حالات کے لحاظ سے بدلا جا سکتا ہے۔ حکمتِ عملی میں لوگوں کے اچھے یا بُرے رجحانات کے لحاظ سے تغیّر کیا جا سکتا ہے۔ مگر اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور اس کی دعوت کے جو اُصول مقرر کر دیے ہیں اُن میں ذرّہ برابر کوئی ردّ و بدل لوگوں کے رجحانات یا زمانے کے حالات کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جس چیز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے ہمیں ہر حال میں اُسی کو قائم کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جس ملک میں کام کر رہے ہوں اُس کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اِس مقصد کے لیے سعی و جہد کے ایک طریقے کو موزوں پا کر اختیار کر لیں اور دوسرے طریقے کو ناموزوں سمجھ کر ترک کر دیں۔ اِسی طرح جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ مٹانا چاہتے ہیں ان کو مٹانا ہی ہماری کوششوں کا ہمیشہ مقصود رہے گا، یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی استطاعت اور ملک کے حالات، اور عوام کی مزاجی کیفیات کو دیکھ کر یہ طے کریں کہ کن چیزوں کو مٹانے کی کوشش مقدم اور کن کے مٹانے کی کوشش مؤخر رکھی جانی چاہیے۔ نیز یہ کہ اِس غرض کے لیے ہم کونسی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں، اور کن تدابیر کا اختیار کرنا غیر ممکن، غیر مفید، یا غیر مناسب ہے۔

اللہ تعالیٰ ظالموں کو غلبے کا موقع کس حد تک دیتا ہے؟

سوال: "اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق کاذب، ظالم اور خبیث قسم کے حکمرانوں کو شریف اور خدا ترس لوگوں پر زیادتیاں کرنے، دینِ حق کا راستہ روکنے، عوام کو ذلیل و خوار کرنے اور قومی وسائل کو اپنی ذات کے مفاد میں استعمال کرنے کا موقع کس حد تک عطا فرماتا ہے۔

نیز پاکستان میں ایسے حالات جاری رہنے کے کس حد تک امکانات ہیں اور نظامِ اسلامی کے غلبہ کے بارے میں یہاں کیا توقعات ہیں۔"

جواب: اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں اور اپنی حکمتوں کو خود ہی جانتا ہے، ہمارے پاس اُن کو جاننے اور سمجھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اُس نے مختلف جباروں اور مختلف ظالم قوموں کی رسی جتنی چاہی ہے دراز کی ہے، اور جب چاہا ہے ان کو اٹھا کر اِس طرح پھینکا ہے کہ وہ عبرت بن کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال اپنی زمین کا منتظم پیڑا اُس نے کسی شخص یا قوم یا مجموعۂ اقوام کو کبھی لکھ کر نہیں دے دیا ہے۔ یہ معاملہ چونکہ ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لیے خدا کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے ہمیں اس فکر میں نہیں پڑنا چاہیے کہ جو طاقتیں اس راہ میں مزاحم ہیں ان کی رسی خدا نے کتنی دراز یا کتنی کوتاہ رکھی ہے۔ ہمیں اپنا فرض صبر و حکمت کے ساتھ بہر صورت ادا کیے چلے جانا چاہیے، خواہ اس کے نتائج نکلنے میں کتنی ہی تاخیر ہو، اور وہ نتائج ہماری آنکھیں دیکھ سکیں یا نہ دیکھ سکیں۔

باطل کے لیے کام کرنے والوں کی طرح حق کے لیے کام کرنے والوں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ مختلف رہا ہے۔ کبھی اُن کے حصے میں صرف جان و مال اور وقت و محنت کی قربانی ہی آتی ہے، دنیوی کامیابی انہیں عطا نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اللہ ان سے ناراض اور ظالموں سے راضی ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس قوم میں وہ کام کر رہے ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق نہیں بناتی کہ اللہ اسے نیک رہنما اور عادل فرمانروا دے، بلکہ اِس کے برعکس اُس کی شقاوت اور دنائت اپنے رب سے گمراہ کن رہنما اور جابر و ظالم فرمانروا ہی مانگتی ہے اور وہی اسے دیے جاتے ہیں۔ مگر اس صورت میں اہلِ حق کا کیا ہوا کام ضائع ہرگز نہیں ہوتا۔ آخرت میں تو اُن کا اجر بہر حال محفوظ ہے ہی، دنیا میں بھی جو بیج وہ بو جاتے ہیں وہ کبھی نہ کبھی پھل لا کر رہتے ہیں، خواہ ان کے بار آور ہونے میں صدیاں لگ جائیں۔

پھر کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اہلِ حق کو کامیابی نصیب ہوتی ہے، مگر آسانی کے ساتھ نہیں بلکہ بڑی تکلیفیں اُٹھا کر اور ہر طرح کے ظلم و ستم کی چکی میں پس کر ہوتی ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال آپ کے سامنے خود اُن بندگانِ حق

کی موجود ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر حضورؐ کی رہنمائی میں وہ دین قائم کیا جسے قائم کرنے کے لیے آج آپ اُٹھے ہیں۔ اُن کے ساتھ یہ معاملہ تو نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے خوب دل لگا کر فرائض و نوافل ادا کیے ہوں اور ایک روز فرشتوں نے آکر اُن سے کہا ہو کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عبادت اور ذکر و اذکار سے بہت خوش ہوا ہے، چلیے اب تختِ سلطنت آپ کے لیے تیار ہے۔ یا کفر و فسق کے زیر سایہ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی تبلیغ کرتے رہے ہوں اور ایک وقت اچانک ایسا آگیا ہو کہ کفار و فساق آپ ہی اُن کے حق میں اقتدار سے دستبردار ہو گئے ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مکہ معظمہ میں (ابتدائی خفیہ دعوت کا زمانہ چھوڑ کر) مسلسل دس سال تک حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں پر سخت سے سخت ظلم کیے گئے۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر گھسیٹا گیا۔ کسی کو آگ کے انگاروں پر ڈال کر اُوپر سے پتھر رکھ دیے گئے۔ کسی کو اُلٹا لٹکا کر اور چٹائی میں لپیٹ کر دھونی دی گئی۔ کسی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ کسی کو پانی میں غوطے دیے گئے۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو گھر بار چھوڑ کر بے سروسامانی کے عالم میں حبش کی طرف نکل جانا پڑا۔ پے در پے مصائب کے یہ دس سال گزارنے کے بعد جب مدینے میں پناہ کی ایک جگہ اور حامیوں کی ایک جماعت ملی تو وہاں بھی کوئی پھولوں کی سیج تیار نہ تھی۔ ۹ سال تک وہاں گھر کے منافقوں، پڑوس کے یہودیوں، اور پورے عرب کے مشرکوں سے ایک شدید جانگسل کشمکش برپا رہی جس میں کبھی ایک دن کے لیے بھی چین نصیب نہ ہوا۔ غارِ ثور کی انتہائی خطرناک پناہ گزینی سے لے کر غزوۂ تبوک کے جیشِ عُسرت تک سارا زمانہ ایسی حالت میں گزرا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ۔ "ہم ضرور تمہیں آزماکر رہیں گے کچھ خوف سے کچھ بھوک سے اور کچھ مال اور جان اور پیداوار کے نقصانات سے۔" یہ مراحل جب صبر و استقامت کے ساتھ گزار لیے گئے تب کہیں دینِ حق کے علمبردار اور اس کے مجاہد ساتھیوں کی آنکھیں يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کا منظر دیکھ کر ٹھنڈی ہو سکیں۔

یہ سب کچھ کس لیے تھا؟ کیا ظالموں کے ظلم سے اللہ راضی تھا اس وجہ سے وہ ان کو اپنے نیک بندوں پر زیادتیاں کرنے کی کُھلی چھوٹ دیے جا رہا تھا؟ کیا اللہ رحیم و رحمٰن کو یہ پسند تھا کہ اُس کے باغی عیش کریں اور اُس کے وفادار بھوکے مریں؛ ماریں کھائیں؛ گھر سے بے گھر کیے جائیں؛ اور میدانِ جنگ میں صرف قتل ہی نہ کیے جائیں بلکہ اُن کے کلیجے تک چبا ڈالے جائیں؟ اگر آپ یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اصل بات یہ نہیں ہے تو پھر خوب سمجھ لیجیے کہ اللہ جل شانہٗ اسلام کی دعوت لے کر اُٹھنے والوں کے لیے آزمائشوں کی بھٹی ضرور گرم

کرتا ہے، تاکہ کوئی بودا اور خام آدمی اِس میدان میں قدم نہ رکھنے پائے، اور جو لوگ بھی ایمان کا اقرار کرکے اِس راہ پر آئیں وہ لازماً اِس بھٹی سے گزارے جائیں تاکہ حق و صداقت کے ساتھ ان کا عشق، اور دین کی سربلندی کے لیے ان کا عزم، اور اقامتِ دین کے لیے ان کا کردار پختہ اور قابلِ اعتماد ہو جائے۔ اس کے بغیر اُن کو اللہ اور اُس کے دین کے نام پر دنیا میں حکومت و فرمانروائی کا موقع دے دیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ کافروں کی جگہ مسلمان خلقِ خدا پر ظلم کرتے، اور اُن کی خیانتیں اور بدکرداریاں دیکھ کر دین اور اہلِ دین کی ساکھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی۔

اِس حقیقت کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں تو کبھی آپ کے ذہن یہ سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں کہ اللہ کب تک ظالموں کو ظلم کی چھوٹ دیے رکھے گا؟ اور اِن حالات میں اسلامی نظام کے قائم ہونے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ خوب جان لیجیے کہ اِس سرزمین میں اسلام کا غلبہ اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اِس مقصد کے لیے کام کرنے والے اُسی بھٹی سے گزریں جس سے دَورِ اوّل کے اہلِ ایمان گزرے تھے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ہر قربانی دینے، ہر مشقت اُٹھانے، ہر نقصان بھگتنے اور ہر خطرہ برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جب تک یہ امتحان وہ پاس نہ کر لیں گے اُن پر ایک دارالاسلام کے انتظام کی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا، کیونکہ وہ اِس بوجھ کو سہار نہ سکیں گے۔ اسلام کے نام پر کسی نیم پختہ گروہ کو اگر حکومت دے دی جائے اور پھر اس کے لائے ہوئے حاکم خائن نکلیں، اختیارات کا ناجائز استعمال کریں، اپنی اغراض و خواہشات کے بیجا تقاضوں سے مغلوب ہو کر انصاف اور امانت کا خون کرنے لگیں، قوم کے مال میں ناروا تصرف کریں، اپنے آپ کو قانون سے بالاتر قرار دے لیں، اور اقتدار کا بار پڑتے ہی اُن کے اخلاق جواب دے جائیں تو پھر ہمیشہ کے لیے یہاں اسلام کے غلبے کا امکان ختم ہو جائے گا۔ اِس ملک ہی کی آبادی نہیں بلکہ پوری دنیا اسلام سے مایوس ہو جائے گی۔ اِس لیے اِس کو اللہ کی رحمت سمجھیے کہ وہ آپ کو پختہ کرنے کے لیے آزمائشوں کی بھٹی سے گزار رہا ہے اور قبل از وقت آپ پر ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈال رہا۔ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہو گا کہ یہاں ایک ایسی جماعت بن گئی ہے جس میں کھرا سونا ہی پایا جاتا ہے اور کھوٹ سے وہ صاف ہو گئی ہے جس کی دیانت و امانت اور خداترسی قابلِ اعتماد ہے، جو کبر و نخوت اور انانیت و نفسانیت سے پاک ہے، جو اپنی بڑائی کے لیے نہیں اُٹھی ہے بلکہ فی الواقع اللہ کے دین ہی کی بالاتری قائم کرنا چاہتی ہے، تب اللہ کے فضل سے یہ پوری اُمید ہے کہ وہ ایسی جماعت کو دنیوی کامیابی بھی عطا فرمائے گا جس طرح اس کے پیشروؤں کو وہ عطا کر چکا ہے۔ اس لیے صبر اور

ہمت و استقامت کے ساتھ آزمائشوں سے گزریے اور اللہ سے دعا مانگتے رہیے کہ وہ آپ کو اقامتِ دین کے کام کی اہلیت و صلاحیت عطا فرمائے۔ یہی بات ہے جو حضرت خبابؓ بن ارت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ جب انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، تو آپؐ کا چہرۂ مبارک تمتما اٹھا اور آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گذر چکے ہیں ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی تھیں۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب ایک شخص صنعاء سے حضر موت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہو گا۔ مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔

اقامتِ دین کے کام کے لیے فارغ کارکن کیوں؟

سوال:۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبۂ اسلام سے پہلے تمام صحابۂ کرامؓ سے رضاکارانہ تعاون حاصل فرمایا اور صرف اسلامی نظام کے قیام کے بعد ہی کارکنوں کو فارغ کیا گیا تو کیا جماعت اسلامی اس سنّت کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہی ہے؟

جواب:۔ دراصل اس کے لیے لفظِ سنّت کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ یہ تو تدبیر کا معاملہ ہے جس میں حالات اور ضروریات کے لحاظ سے کوئی مناسب طریقِ کار اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مکۂ معظمہ میں جب تک حضورؐ رہے، طریق کار یہ تھا کہ جو لوگ کچھ مال رکھتے تھے وہ اُن لوگوں کی مدد کرتے تھے جو اپنا بار آپ نہ اُٹھا سکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود وہ سارا مال اللہ کی راہ میں صرف فرمایا جو نبوت سے پہلے آپ کے پاس تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے خوشحال مسلمانوں نے بھی اپنی دولت اس کام میں صرف کی۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ایسے اصحاب بھی تھے جن کے ذرائعِ معیشت ظالموں نے ختم یا تنگ کر دیے تھے، اور ایسے نوجوان بھی تھے جنہیں اُن کے گھر والوں نے نکال دیا تھا اور وہ بے سہارا رہ گئے تھے۔ ان سب لوگوں کے لیے چاہے باقاعدہ مشاہرے نہ مقرر کیے گئے ہوں، لیکن ان کی کفالت کسی نہ کسی طرح کی جاتی تھی، ورنہ ظاہر بات ہے کہ وہ خوراک اور لباس کے بغیر تو نہیں رہ سکتے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں بھی ایک مدت تک یہ صورت رہی کہ جو لوگ کفالت کے محتاج تھے اور خود اپنی روزی نہ کما سکتے تھے ان کی کفالت دوسرے اصحاب اپنی استطاعت کے مطابق کرتے رہتے تھے۔ سورۂ بقرہ میں انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ اُن غریب لوگوں کی مدد کی جائے جو "اللہ کی راہ میں ایسے گھر گئے ہیں جو اپنے ذاتی کسبِ معاش کے لیے زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے" (اَلَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ)۔

اُن غریبوں کے اللہ کی راہ میں گھر جانے کا مطلب دین کے کام میں اُن کا اِس طرح مشغول ہو جانا تھا کہ وہ چل پھر کر اپنی روزی کمانے کی فرصت نہ رکھتے تھے، اور ایسے ذرائع بھی ان کو حاصل نہ تھے کہ وہ گھر سے کھا کر خدا کا کام کر سکیں۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے غنیمت اور فے کے اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرما دیے تو ان کا ایک مصرف ایسے خادمانِ دین کی کفالت بھی تھا۔ پھر جن لوگوں کو حضورؐ نے امیر یا عامل، یا محصلِ زکوٰۃ وغیرہ مناصب پر مقرر کیا تو ان کے باقاعدہ مشاہرے بھی مقرر فرمائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف زمانوں میں مختلف حالات کے لیے جو تدبیر موزوں سمجھی وہ اختیار فرمائی۔ ان میں سے کسی تدبیر کو بھی ایسی سنّت قرار نہیں دیا جا سکتا جس کی پابندی ہر حال میں لازم ہو۔ جماعت اسلامی میں فارغ کارکن صرف اُسی صورت میں مقرر کیے گئے ہیں جبکہ جُزوقتی کارکنوں کی رضاکارانہ خدمات سے باقاعدگی کے ساتھ کام نہ چل سکتا ہو، اور ہمہ وقتی خدمات کے لیے ایسے کارکن بھی نہ مل سکتے ہوں جو گھر سے کھا کر اپنا سارا وقت خدا کے کام میں صرف کر سکیں۔

ہم جیسے کمزور لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کیسے برپا ہوگا اور کتنے دن چل سکے گا؟

سوال: "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کی جماعت، جن کے ہاتھوں اسلامی انقلاب برپا ہوا، اُن کے تقویٰ، قناعت، کفایت شعاری، جانی و مالی ایثار، توکل علی اللہ، اور شوقِ شہادت کا معیار اتنا اُونچا تھا کہ جس کا نمونہ موجودہ تحریک اسلامی کے کارکنوں میں پایا جانا تو درکنار اس کا سوواں حصہ بھی نایاب ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ مہم سر کی جا سکے جو صحابہؓ نے سَر کی ہے۔ پھر ایسے بلند مرتبہ رہنماؤں اور کارکنوں کے ہاتھوں جو اسلامی انقلاب برپا ہوا وہ بھی معیاری صورت میں ۳۰ سال ہی چل سکا، صرف اس لیے کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے درمیان پہلے صحابہ جیسے لوگ نہ تھے۔ اب جس معیار کے رہنما اور کارکن تحریک اسلامی میں ہیں ان کے ہاتھوں وہ انقلاب برپا ہونا اوّل تو سخت مشکل ہے، اور اگر وہ برپا ہو بھی جائے تو شاید ۳۰ دن بھی نہ چل سکے گا۔"

جواب: یہ سوال تو ایک پورا خطبہ ہے تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو اپنے نصب العین سے مایوس کر دینے کے لیے۔ اگر اس کا مقصد خود مایوس ہونا اور دوسروں میں مایوسی پیدا کرنا نہیں ہے، تو اس معاملے پر اچھی طرح سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے اعلیٰ درجے کے مربی تھے اور

جیسا بلند ترین نمونہ حضورؐ نے اپنی زندگی کا لوگوں کے سامنے پیش کیا، اس طرح کا کوئی رہنما قیامت تک مسلمانوں کو میسّر نہیں آسکتا۔ اسی طرح حضورؐ کی تعلیم و تربیت کی بدولت جیسے اعلیٰ درجے کے کارکن دعوتِ اسلامی کی خدمت انجام دینے کے لیے اُس وقت تیار ہوئے تھے، اُس پائے کے کارکن بھی تیار کر لینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ اب کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم دینِ حق قائم کرنے کی کوشش ہی نہ کریں؟ اگر اِس کام سے رُک جانے کے لیے یہی دلیل استعمال کی جائے تو اس کے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں۔ یا تو دینِ باطل دنیا میں قائم ہو اور ہم اُس کے تابع بن کر رہیں۔ یا پھر خود بھی دینِ باطل کے قائم کرنے میں لگ جائیں تاکہ دنیوی لذات اور فوائد و منافع سے تو اچھی طرح شادکام ہو سکیں۔ اس کے لیے کسی قسم کی بھی اخلاقی بلندی درکار نہیں ہے۔ صرف پستی کی طرف گرنا ہی ہے جو کسی محنت اور کوشش کے بغیر بآسانی ہو سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ وہ غلط طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں جو اس سوال کے اندر مضمر ہے انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ طرزِ فکر آخر کار ہمیں کہاں پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ اِس کے بجائے اگر وہ صحیح طور پر سوچتے تو سیدھی راہ اُن کے سامنے خود بخود واضح ہو جاتی۔ ایک مومن کے لیے سیدھی راہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ جس بلندی پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں اُس کی طرف چڑھنے کے لیے وہ جتنی کوشش کر سکتا ہے کرے اور عمر بھر کرتا چلا جائے اور اپنی طرف سے اس میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھے۔ اس بلندی پر چڑھتے ہوئے اگر کوئی شخص تھک کر راستے میں گر جائے اور وہیں مر جائے تو وہ کامیاب ہے۔ لیکن اگر ایک آدمی یہ دیکھ کر کہ چڑھائی بہت اُونچی ہے کھڈ کی طرف جانا شروع کر دے تو جائے گا بڑی آسانی سے لیکن گرے گا بھی ایسی جگہ جہاں اس کا پُرزہ پُرزہ بکھر کر رہ جائے گا۔ قرآن پاک کو آپ غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ انسان کو سیرت و اخلاق کی بلندیوں پر چڑھنے سے مایوس نہیں کرتا بلکہ اُس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی "جس نے راہِ خدا میں مال دیا اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ مانا اُس کو ہم آسان راستے کی سہولت دیں گے"۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا صریح وعدہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ "جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ان کو اپنے راستوں کی ہدایت ہم خود دیں گے"۔ لہٰذا آپ اللہ کی راہ میں جان لڑائیں اور اُس سے توفیق مانگتے رہیں۔ اپنی ایک ایک کمزوری کو سمجھیں اور اُسے دُور کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے اندر جو بہتر صلاحیتیں پائیں ان کو بھی اچھی طرح سمجھیں اور ان کو ترقی دینے

کی کوشش کریں۔ اس تزکیۂ نفس میں قرآن و حدیث اور سیرت پاک اور صحابہ و اخیارِ اُمت کی سیرتیں پڑھنے سے بھی بڑی مدد مل سکتی ہے، اور اگر جماعت کے سب افراد اس کوشش میں لگے ہوئے ہوں تو وہ سب بھی ایک دوسرے کے مددگار بن سکتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کو پستیوں سے اُٹھانے اور بلندیوں کی طرف لے جانے کی جتنی کوشش بھی آپ اللہ کے بھروسے پر کریں گے اتنے ہی بلند مراتب پر اللہ تعالیٰ آپ کو پہنچا دے گا، کیونکہ یہ اس کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرنا بجائے خود بھی انسان کی اصلاح و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلام میں جو اخلاقی بلندی مطلوب ہے وہ باطل کے مقابلے میں لڑنے اور حق قائم کرنے کی کوشش میں جان لڑانے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام کی جس بلندیِ مدارج کو دیکھ کر آپ پر حیرت اور مایوسی کا عالم طاری ہونے لگتا ہے وہ کسی گوشۂ عزلت میں چلّے کاٹنے کا ثمرہ نہ تھی بلکہ اللہ کی راہ میں مار کھانے، اذیتیں سہنے، قیدیں برداشت کرنے، بھوکے مرنے، نقصانات اُٹھانے، خطرات کا سامنا کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے سے حاصل ہوئی تھی۔ آدمی کو اللہ اور اُس کے دین سے عشق نہ ہو تو وہ اس وادیِ پُرخطر میں اتر ہی نہیں سکتا، اور جب وہ اس میں اترتا ہے تو ہر چوٹ کھا کر اُس کا عشق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہی عشق اُن بندگانِ حق کو اتنی بلندیوں پر اُٹھا لے گیا۔ آپ باطل سے لڑنے اور اس کی جگہ حق قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے تو اللہ آپ کے ساتھ کسی بخل سے کام نہ لے گا۔

اب رہا یہ خیال کہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کا برپا ہو جانا ہی سخت مشکل ہے، اور اگر وہ ہو بھی جائے تو تیس سال کیا، تیس۳۰ دن بھی قائم نہ رہ سکے گا، تو اس کے متعلق میں بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے اُوپر اسلامی نظام برپا کر دینے کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے، بلکہ اُس کے لیے جان لڑانے کی ذمہ داری ہی ڈالی گئی ہے۔ اُس کا برپا ہونا یا نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، اور یہ بھی اللہ کی مشیت ہی پر منحصر ہے کہ وہ قائم ہو تو کب تک چلے اور کب تک نہ چلے۔ لہٰذا ان باتوں کو سوچ سوچ کر تھڑدلی میں مبتلا ہو جانا درست نہیں ہے۔ آپ کے کرنے کا جو کام ہے اُسے اپنی حد تک زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے کرنے کی کوشش کریں، اور اللہ کے کرنے کا جو کام ہے اسے اللہ پر چھوڑ دیں۔ (باقی)

مطبوعات

مذہب اور سائنس | تالیف مولانا عبدالباری ندوی

شائع کردہ: مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ، لاہور۔

قیمت مجلد: -/۱۵ روپے - صفحات: ۲۳۸

اس کتاب کے مصنف علمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ایک طویل مدت تک عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے اُستاد رہے۔ علمی زندگی کے آغاز میں انہوں نے فلسفے کی بعض ادق کتابوں کو بڑے سلیقے کے ساتھ اُردو کے قالب میں ڈھالا۔ یونیورسٹی کی ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ پوری یکسوئی کے ساتھ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے اور واجب الاحترام مرشد کے افکار کی تشریح و توضیح کے لیے تجدید معاشیات، تجدید تبلیغ، تجدید تصوف و سلوک جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے دور اوّل کی ذہنی افتاد اور علمی کمالات کا عکس پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سائنس کے تناقضات، اس کی بے جا جسارتوں اور بلند بانگ دعووں کا پردہ چاک کیا ہے اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ سائنس کی جولانگاہ بڑی محدود ہے اور اسے کسی طرح بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کے دائرہ کار میں دخل اندازی کرے۔ فاضل مصنف نے سائنس کی محرومیوں کا جس عالمانہ انداز میں نامور مغربی مصنفین کی ٹھوس شہادتوں کے ساتھ تذکرہ کیا ہے وہ بڑا وقیع اور قابلِ قدر ہے اور اس کے مطالعہ سے فکر و نظر کے کئی ایک نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔

فاضل مصنف کے عالمانہ مباحث ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں لیکن تبصرہ نگار کو ان میں ایک چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ آج سے دو صدیاں پیشتر جب سائنس کی یلغار شروع ہوئی تو اہلِ دین نے مذہب کو اس کی دست برد سے بچانے کے لیے استدلال کا یہ انداز اختیار کیا کہ چونکہ مذہب اور سائنس کے دائرے ایک دوسرے سے الگ ہیں لہٰذا ان کے مابین باہمی آویزش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سائنس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے اور مذہب کی بنیاد وحی اور الہام پر۔ مذہب انسان کو اخلاقی اور روحانیت کے دائرے میں رہنمائی عطا کرتا ہے اور اس کے مقابلے میں سائنس انسان کی مادی زندگی سے متعلق مستند معلومات فراہم کرتی ہے۔

کتاب کے فاضل مصنف کا طرزِ استدلال بھی قریب قریب یہی ہے اور اسے غلط بھی نہیں کہا جا سکتا

جہاں تک سائنس اور مذہب کے نقطہ ہائے آغاز، اُن کے اساسی تصوّرات اور مقاصد کا تعلق ہے وہ بلاشبہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن سائنس جس سمت آگے بڑھ رہی ہے اور حیات انسانی کے روحانی اور اخلاقی گوشوں کو جس طرح متاثر کرتی جا رہی ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس اب مابعد الطبیعاتی اور اخلاقی مسائل پر بڑے جارحانہ انداز میں بحث کرتی ہے اور اپنی بےبسی کا اعتراف کرنے کے بجائے بڑے اعتماد کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کرتی ہے کہ وہ زندگی کے سارے معاملات کو بطریق احسن حل کرنے کی قدرت رکھتی ہے اور اپنے ان دعووں کی صداقت میں یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ دورِ حاضر میں کئی ایک قومیں جو کسی مذہب پر ایمان نہیں رکھتیں وہ ایک نئی اخلاقی قوت کی حیثیت سے اپنے وجود کو تسلیم کروا رہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ کتاب کے فاضل مصنّف سائنس کے اس دعویٰ پر بھی غور فرما کر اس کا ابطال کریں گے۔

مذہب اور سائنس ایک نہایت بلند پایہ علمی کاوش ہے اور اس کی تصنیف و اشاعت کے لیے مصنف اور ناشر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔ علمی انحطاط کے اس دَور میں جو حضرات بھی علم اور خصوصاً دینی علم کی شمع روشن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے۔

کتاب کا معیار طباعت و کتابت عمدہ ہے۔

حیاتِ سعد یعنی سیرت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالےٰ عنہ	تالیف: جناب طالب ہاشمی ناشران: قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور۔ قیمت: نو روپے۔ صفحات ۲۶۴

زیر تبصرہ کتاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس جلیل القدر اور خوش نصیب صحابی کا تذکرہ ہے جسے خود لسانِ رسالت نے اس کی زندگی ہی میں مغفرت اور جنت کی بشارت دے دی تھی حضرت سعد رضی اللہ تعالےٰ عنہ حضور رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے ۱۹ برس کی عمر میں اسلام لائے۔ چونکہ ان کا گھرانہ قریش کے بعض دوسرے گھرانوں کی طرح اسلام کا سخت مخالف تھا اس لیے حضرت سعدؓ کو بھی اپنی خاندانی وجاہت کے باوجود کفارِ مکّہ کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بننا پڑا لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی معمولی لغزش بھی نہ آئی۔ انہوں نے آزمائش اور ابتلا کے ہر دَور کو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ شعب ابی طالب میں انہوں نے رضاکارانہ طور پر پیروانِ اسلام کے مصائب میں شرکت کی حالانکہ یہ مقاطعہ صرف

بنی ہاشم کے لیے تھا وہ اگر چاہتے تو اس کی زد سے بڑی آسانی کے ساتھ بچ سکتے تھے۔ انہوں نے جنگ بدر میں بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا لیکن جنگ احد میں یہ پیکر استقامت جس جیرت انگیز قوت ایمانی کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوا وہ فدائیت اور جاں نثاری کی نہایت ہی [illegible] مثال ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ حضرت سعدؓ کا جسم دشمنوں کی تیر اندازی سے لہولہان ہو گیا لیکن وہ حضورؐ اور دشمنوں کے مابین ایک ڈھال بن کر کھڑے رہے۔ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خود اپنے ترکش سے تیر نکال نکال کر دیتے اور فرماتے: میرے ماں باپ تم پر فدا، تیر چلاتے جاؤ۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص ایک جری اور بہادر سپہ سالار ہونے کے علاوہ سیاسی اور اجتماعی معاملات میں بھی گہری بصیرت رکھتے تھے۔

یہ کتاب معلومات افزا ہونے کے علاوہ دلوں کو بھی گرمانے والی ہے۔ اس کے مطالعہ سے حق کی خاطر ایثار اور قربانی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ اس میں حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی پاکیزہ زندگی کے حالات کے علاوہ اُس دور سعادت کا نقشہ بھی آگیا ہے جس میں اس قسم کی مقدس ہستیاں پیدا ہوئیں۔

انداز بیان دلکش اور رقت آمیز ہے۔ طباعت و کتابت عمدہ ہے۔

فلسفۂ ختم نبوت | تالیف: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ۔

شائع کردہ: مسلم اکادمی وزیر پورہ سیالکوٹ۔ قیمت: ۳/- روپے صفحات: ۴۰

یہ کتابچہ مولانا سیوہاروی کا فکر انگیز مقالہ ہے جو انہوں نے قصص القرآن کی چوتھی جلد کے دوسرے ایڈیشن میں ایزاد کیا تھا۔ مسلم اکادمی سیالکوٹ نے اس موضوع کی افادیت کے پیش نظر اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس میں فلسفہ ختم نبوت کی وضاحت کے لیے وہی طرز استدلال اختیار کیا گیا ہے جو ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اختیار کیا تھا کہ دنیا ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں پوری نوع بشری ایک کنبہ کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے آخری نبی مبعوث فرما کر سلسلۂ نبوت اُن کی ذات مقدس پر ختم کر دیا۔ یہ استدلال گو بظاہر بڑا وزنی محسوس ہوتا ہے لیکن اس سے ذہنوں کی پوری طرح تشفی نہیں ہوتی اور اس سلسلے میں سب سے اہم سوال

(باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) سزاؤں کے نفاذ کے خلاف ہیں ہماری نظر میں کسی فقیہہ کا قول نہیں گذرا جس سے ان کے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہو۔ الاستاذ مصطفیٰ زرقا، الاستاذ ابوزہرہ، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب بھی وہ بلند پایہ فقہا ہیں جن کی دینی بصیرت پر اُمت مسلمہ کی عظیم اکثریت کو اعتماد ہے۔ ان حضرات نے سینکڑوں مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جسٹس صاحب اگر کسی تقریر یا تحریر سے یہ ثابت کر دیں کہ یہ اصحاب بصیرت شرعی سزاؤں کے نفاذ کو آج کے دور میں غیر ضروری سمجھتے ہیں تو یہ ان کی بہت بڑی دینی خدمت ہوگی۔ ہمارے سامنے وقتاً فوقتاً ان حضرات کے جو خیالات آتے رہے ہیں ان سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان حکومتوں پر زور دیتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے دائرہ اقتدار میں اسلامی نظام قائم کریں اور اپنی اپنی حدود میں نظام شرعی رائج کر کے خدا اور خلق کے سامنے سرخرو ہوں۔

جسٹس صاحب نے "جرم و سزا" پر جو بحث کی ہے وہ بھی اُن کی پریشان فکری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مالک کائنات جو انتہائی رحیم و کریم ہے اور جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات کی ہر شے ہے، اس سے یہ بات بعید ہے کہ وہ بے صبری کے عالم میں اس چند روزہ زندگی میں لوگوں پر سزائیں نافذ کرنے کا التزام کرے۔ دنیا میں کونسا ایسا شخص ہے جس سے چھوٹے بڑے گناہ سرزد نہ ہوتے ہوں۔ اگر ان سب گناہوں پر دنیوی زندگی ہی میں مواخذہ ہونے لگے تو کیا یہ دنیا دار العذاب نہ بن جائے گی جو خدا کی شانِ کریمی کے منافی ہے۔ جسٹس صاحب کی تصریحات پر غور فرمائیں۔

"سزا تو اس دنیوی زندگی میں نافذ نہیں کی جا سکتی (جس چیز کو ہم سزا) کہتے ہیں وہ اعمال بد کے قدرتی نتائج ہیں، اس لیے ان پر اصطلاحی معنوں میں سزا کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ خداوند تعالیٰ اپنی شانِ رحیمی میں (لوگوں کے) گناہوں سے صرف نظر کرتا ہے اور اُنہیں توبہ کے لیے بار بار مواقع فراہم کرتا ہے۔

ہم جسٹس صاحب کی خدمت میں بصد احترام عرض کرتے ہیں کہ وہ براہ کرم اپنے استدلال پر غور فرمائیں۔ چونکہ وہ قرآن کو دین میں حجت مانتے ہیں اور جو باتیں قرآن حکیم میں درج ہیں ان کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے ہم ان سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس موقف کا قرآن مجید کے احکام کی روشنی میں جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ان کا یہ موقف کس قدر غلط ہے۔ اگر سزا کا اصل وقت اور مقام یہ ہے کہ انسان دنیوی زندگی کی سرحد عبور

لر کے اُخروی زندگی میں داخل ہو جائے تو پھر قرآن مجید میں مختلف جرائم کے لیے جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں اُن کی کیا افادیت باقی رہ جاتی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی کتاب میں محض زیب داستان کے لیے شامل کیا ہے؟ کیا قرآن مجید میں چوری اور زنا کے لیے جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں وہ مجرموں کی اُخروی زندگی کے لیے ہیں؟ دنیا میں انہیں ہر سزا سے محفوظ و مامون رکھا گیا ہے؟

جسٹس صاحب کا یہ خیال بھی یکسر نرالا ہے کہ اگر مسلمان اپنے احاطہ اقتدار میں خدا کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے ان اجتماعی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں جو کائنات کے فرمانروائے حقیقی کی طرف سے ان پر عاید ہوتی ہیں تو وہ شرک جیسے گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور کائنات پر اپنی حاکمیت غیر مرئی قوانین کے ذریعہ مسلط کر رکھی ہے۔ اب اگر مسلمان اس حاکمیت کو مرئی ضابطوں کی مدد سے کسی معاشرے پر قائم کریں تو یہ حاکمیت الٰہی میں شرکت کے مترادف ہے اور اس آسمان کے نیچے اس سے زیادہ سنگین جرم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جسٹس صاحب اس ملک میں علمی اعتبار سے ایک نامور ہستی ہیں اور وہ قانونی اصطلاحات اور ان کے مضمرات سے بخوبی واقف ہیں ہم اُن سے یہ دریافت کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ کیا تفویض کردہ محدود حاکمیت اور اصل حاکمیت ایک دوسرے کے مدمقابل موقف ہیں۔ کیا حاکم اعلیٰ کی نیابت کے معنی اس کی حاکمیت میں بے جا مداخلت اور شرکت کے ہیں؟ دنیا میں تو آج تک نیابت کا یہی مفہوم سمجھا جاتا رہا ہے کہ جو فرد، گروہ یا ادارہ نیابت کا منصب قبول کرتا ہے وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اصل حاکم کا نائب اور خلیفہ ہے جسے اُس کے عطا کردہ دائرہ اختیار میں حاکم حقیقی کے منشا کو ہی پورا کرتا ہے۔ یہ راز ہم پر آج جسٹس صاحب کی نکتہ آفرینی سے کھلا ہے کہ نیابت اصل حاکم کے خلاف بغاوت اور سازش کا منصب ہے۔

(بقیہ مطبوعات) یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا ایسا حتمی معیار ہے جسے سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس عہد میں تشریف لائے وہ واقعی عقلی اعتبار سے بالکل نیا دور تھا اور انسانی برادری ایک وسیع کنبے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اگر کسی مفکر کے نزدیک یہی معیار قطعی ہے تو پھر اس معیار کی صحت پر بھی دلائل لانے کی ضرورت ہے۔

TRANSLATIONS FROM THE QURAN

by

ALTAF GAUHAR

Based on the Urdu rendering and explanatory notes contained in Syed Abul A'la Maudoodi's celebrated work Tafheem-ul-Quran.

With an exhaustive and perceptive introduction by the author on Islam and Secularism.

A significant contribution to Islamic Studies.

PRICE Rs. 25.00

Available at all book shops

Published by

IDARA TARJUMAN-UL-QURAN

ICHHRA, LAHORE (PAKISTAN)